کرشن موہن

ناشر

نیشنل اکاڈمی

انصاری مارکیٹ، دریا گنج، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

پھلی بار: مئی ۱۹۷۶ء
قیمت : دس روپے

زیر اهتمام : پریم گوپال متّل

کتابت : جمال گیاوی
مَطبع : نعمانی پریس، دهلی

ترتیب

نظمیں :

غزلیں :

ملامتیوں کے نام

دل پھر طوافِ کوے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کیے ہوئے

—— غالبؔ

شوق کی رفعت یہی ہے عشق کی عظمت یہی
آدمی کو شہر میں بدنام ہونا چاہیے

—— کرشن موہن

وشوامتر کی آتما

گیان مارگ درشانے والی شخصیتوں کا دھیان آتے ہی زندگی کرنے کے وہ کٹھور دستور یاد آنے لگتے ہیں جن کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے کچھ لوگوں نے اپنی ذات کے دشت و صحرا سے نکل کر کھلے اور روشن آسمانوں کی حقیقت کا مژدہ سُنایا تھا۔ گیان مارگ' دراصل مارگ نہیں بلکہ ایک طول طویل، کبھی نہ ختم ہونے والی سرنگ ہے اور اس اندھیری سرنگ میں روشنی کا حصول ہی ان کربناک سوالوں کا جواب ہے جو زہریلے سانپوں کی طرح پھن اٹھا اٹھا کر انسان کی تنہائیوں میں اپنا زہر گھولتے رہتے ہیں۔

اُردو ادب میں گیان مارگ کے نغمے سنانے والا شاعر

کرشن موہن ایک سنساری منشیہ ہے۔ زندگی کی آسائشیں اور سُکھ اسے لبھاتے ہیں، دھرتی کے رنگ منچ پر ہونے والے برہنہ تماشے اسے رجھاتے ہیں اور ست رنگی گلال میں ڈوبے نظارے اس کے سامنے راس رچاتے ہیں۔ وہ وِشوامتر کی زندگی کے صرف ان لمحوں کو جینا چاہتا ہے جب وہ مینکا کے حُسن کے رنگ محل میں پھولوں کی معطر سیج پر ان دیکھے خوابوں میں گم تھا اور اس اندھیری سرنگ کو بھول گیا تھا جس سے اسے سفّاک دستوروں کے جولان پہن کر گزرنا تھا۔

کرشن موہن انہی لمحوں کا اسیر وِشوامتر ہے گیان اس کے اندر ہے اور زندگی کا تمام تر حُسن اس کے باہر، جسے وہ جلد سے جلد اپنی جھولی میں بھر لینا چاہتا ہے۔ اس کا گیان مارگ اس کی اپنی دریافت ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ اس نے اندھیری سرنگ میں سے گزرتے ہوئے جگہ جگہ سے دو چار پتھر نکال کر چھوٹے چھوٹے روزن بنا ڈالے ہیں —— ان روزنوں سے جب وہ سرنگ کے باہر دیکھتا ہے تو اسے دنیا بہت وسیع، زنگار رنگ اور اجلی نظر آتی ہے۔ اور وہ اس کے آزاد برہنہ منظروں کو اپنی نظموں میں قید کر لیتا ہے۔ اور جب وہ سرنگ کے اندر نظر دوڑاتا ہے تو وہاں سورج کی گرم شعاعیں بھی ہیں اور چاند کی ٹھنڈی کرنیں بھی جو اس کے اشعار میں ایک الگ جھلک دکھاتی ہیں۔

گیان مارگ کی نظمیں سے کوے ملامت تک یعنی سرنگ کے اندر سے سرنگ کے باہر تک کرشن موہن کا شعری سفر ایک —— ایسے گرم خوں مسافر کی سرگزشت ہے جس نے انسانی زندگی کے اُجاڑ اور بے رنگ اندھیروں میں ایک ایسا چراغ روشن کیا ہے جس کے نرم گرم

اجالوں میں اس پھولوں بھری سیج کی مہک کو صرف محسوس ہی نہیں کیا
جاسکتا بلکہ دیکھا بھی جاسکتا ہے جس کے تیکھے نشے نے وِشوامتر کو
اپنے پاؤں کی زنجیروں کو توڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔

کرشن موہن کو بھی حُسن کی دل فریبیاں عزیز
ہیں جن سے اس نے زندگی کا قرینہ سیکھا ہے مثلاً:

برت اور بھکشا
دعا و ریاضت میں رکھا ہی کیا ہے
کہاں یہ، کہاں خوبصورت جوان عورتوں سے بغل گیر ہونے کی لذّت
وہ مخمور آنکھیں، وہ مغرور سینے
سِکھاتے ہیں جو زندگی کے قرینے

O

مادہ پرستی اس کے یہاں عرفانِ زندگی ہی کی ایک شکل ہے۔ وہ بھلے ہی
ایک عام سنساری مُنشیہ سہی لیکن اس کے اندر جو شاعر جی رہا ہے وہ
بیک وقت اپنے محسوسات کا غلام بھی ہے اور ان کا حاکم بھی۔ کبھی وہ محسوسات
کے پیچھے چلتا ہے اور کبھی محسوسات اس سے اپنی منزل کا پتہ پوچھتے ہیں۔
پیرس کے بدن گرماتے ساحل ہوں یا جاوا کے ملن رس میں ڈوبے
ہوئے ٹاپو۔ اس کی ازمٹ پیاس اسے اپنے دیش کی رنگینیوں اور بدیش
کے خوابوں میں لیے گھومتی ہے۔

کوئے ملامت کے سرسری مطالعے کے بعد ایک عام قاری
ممکن ہے اسے محض جسمانی پیاس کا نام دے مگر ان منظومات کی تہہ میں
زندگی کے ہر پل سے لطف اندوز ہونے کا جو رجحان ملتا ہے اس سے صاف

ظاہر ہے کہ کرشن موہن کے اندر سانس لینے والا شاعر اپنے قاری کو زندگی کے صرف وہی مناظر دکھانا چاہتا ہے جو بہت ہی اُجلے، رنگا رنگ اور وسیع ہیں۔ اس کے اندر اس وشوامتر کی آتما جی رہی ہے، جس نے گیان مارگ کی کٹڑیل، اندھیری سرنگ میں جگہ جگہ روزن بنا ڈالے تھے اور اپنی اندھی پیاس کو روشنی سے سیراب کیا تھا۔

دہلی
۶؍اپریل ۱۹۷۶ء

کمار پاشی

نظمیں

تانے بانے

ردیف و قوافی کے بُن تانے بانے
نہ کر فکر کچھ فکر کی، ایک زیبا
مکاں کر کے تعمیر، اس میں پرانے
سب اسباب رکھ دے
نہ کمروں میں پردے نہ قالین کوئی
مقفّل مقفّل
حقیقت میں اک محبسِ سخت و سنگیں

تو پھر اس مکاں میں ہے دیوار و در کے سوا رکھا ہی کیا

تجھے دی ہے بس اس کی قدرت خدا نے
ردیف و قوافی کے بُن تانے بانے

○

تیل کے لیے دعا

ہے یہ عہدِ پاستاں کی داستاں
اک جزیرے میں کچھ ایسی عورتیں پائی گئیں
جن کے جسموں پر تھے پستاں جابجا
پشت، بانہوں، پیٹ اور رانوں کے پنانوں سے بھی
اُن کے بچّے رات دن پیتے تھے دُودھ
کیا عجب مخلوق تھی

اپنی دھرتی بھی کچھ ایسی ہی عجب مخلوق ہو
اپنی دھرتی پر بجائے دُودھ کے
تیل کے چشمے ہی پھوٹیں جابجا
اے عجائب کے خُدا
خالقِ ارض و سما

○

بادام

مچھلیاں لہرائیں

وہ مرے سامنے بیٹھی تھی، مجھے چاٹ گئی
اجنبیت کی جو کھائی تھی اُسے پاٹ گئی
اُس کے بادام مجھے کاٹ گئے
شوخ بادام نُکیلے بادام
چُلبلی اور چھبیلی بادام
ایک چالاک پرندے کا دام
پتّیاں اُس کی جو ہلتی ہی رہیں
اُن پہ کچھ کلیاں سی کھلتی ہی رہیں
سنگِ مرمر پہ حسیں نقش و نگار
جن پہ بادام پھسلتے ہی رہے
یہ ہوا کتنی ہی بار

ایک تقریر تھی تحریر شدہ
جس میں میرے لیے کچھ جوش نہ تھا
"کافی" آئی تو مجھے ہوش نہ تھا
کیونکہ چھائی تھیں گھٹائیں اُس کی
اس نے دشنے بھی چلائے کتنے
شوخ بادا موں نے
سرِ محفل میں جگائے فتنے
رنگ نیرنگ ہوا
کھُل گئی اتنی ردیف
قافیہ تنگ ہوا
بعدِ تقریر سوالات ہوئے
پوچھنے والے لوگ
اجنبی ذہن سے کچھ مات ہوئے ...
لیکن افسونِ جنوں ...
شوخ باداموں سے میں مات ہوا
سر بسر مات ہوا

○

فکرِ نو

مِلا ہے کیا خوب ذہنی آزادگی کا ثمرہ
دھواں دھواں ہے تمام کمرہ
کہ ٹین ایجر یہاں روایت کے پیرہن کو اتار کر رسمِ وضع داری پہ خندہ زن ہیں
نشیلے ناچوں میں کامنا کے، مدھر ملن ہیں
شراب کی خالی بوتلیں، یہ پرانا گھڑیال، اُلٹی لٹکی ہوئی یہ سائیکل
یہ چند ٹوٹے مجسّمے جو چھبیلے طاقوں سے گھورتے ہیں
یہی ہیں کیا فکرِ نو کے مُنظہر رہا؟

○

ذہن کی برف

یاس پہنے دم بخود ہے آرزو کا حرف حرف
رہگزاروں پر، مکانوں پر ہے برف
اور پیڑوں پر ہے برف
سرد ہے سورج کا سوز
مضمحل، حیراں، اُداس
روشنی، دامانِ تنگ
کاش وسعت آشنا ہو اِس کا ظرف
شام کا شرمیلا پن ہے سینہ دوز
سرد تاریکی میں ہوتی جا رہی ہے زیست صرف
ہے مرا اندوہ اشکوں سے بھی ژرف

یاس پہنے دم بخود ہے آرزو کا حرف حرف

ذہن اک اونچا پہاڑ
سلسلہ در سلسلہ، حیراں، سراسیمہ، اُجاڑ
سرد، بے برگ وگیاہ
سرزمینِ اشک وآہ
باخراش و بے خروش
ایک مُدّت سے خموش
برف پوش و کرب کوش
جانے کب ہوگا تغیر آشنا یہ سلسلہ
جانے کب مچلے گی اِس پر شعلہ بر سورج کی سج دھج، جانے کب جاگے فضا
جانے کب پگھلے یہ برف
یاس پہنے دم بخود ہے آرزو کا حرف حرف

تیرہ کمرے کا تفکّر اور یہ شام شباب
ایک تجریدی کتاب
زندگی کا ایک نا رخشندہ باب
اک جمودِ دیرپا میرا وجود

ایک بے پایاں سکُوت
تا بکے میرا لہو پیتے رہیں گے میری اُمیدوں کے بھُوت
رستگاری کا کوئی امکاں نظر آتا نہیں
منجمد احساس تارِ عنکبوت

زندگی واماندۂ تابندگی
قافیہ در قافیہ بے کیف سی نظمِ طویل
منجمد، بے سوز، بے حس تیرہ و تاریک جھیل
برف کا پیراہنِ سنگیں پہن کر میرے عرفان و شعور
ہو گئے محرومِ نوُر
ہر طرف ہے نا اُمیدی کا پڑاؤ
ایک ٹھہراؤ، لہو کا صرفِ بے ہنگام، بے آہنگ و ظرف
سرد تاریکی میں ہوتی جا رہی ہے زیست صرف
دم بخود ہے آرزو کا حرف حرف
ہر طرف ہے برف برف
برف برف

○

ہمسفر

وہ شملے سے کالکا ٹیکسی میں جا رہی تھی
میں ہمسفر تھا
وہ پیچدار اور گول راہیں
سڈول باہیں وہ اپنے پتیم کی باہوں پر رکھے پیار سے مُسکرا رہی،
گنگنا رہی تھی

اور اس کی ٹانگوں کی جاذبیت
مری شرافت پہ چھا رہی تھی
وہ نوجواں ماہروئے دلجو
(تمام ٹیکسی میں اُس کی خوشبو)
لطیف کش لے رہی تھی سگرٹ کے، ایسے گویا

مذاق سنگیں روایتوں کا' اُڑا رہی تھی

وہ اپنے 'پی' کو سمجھا رہی تھی
"تو کیوں نہ ہم ایک ٹیکسی رکھ لیں
کہ ٹیکسی کی آمدن پہ بھی ٹیکس کم لگے گا
کہ ڈارلنگ' کام کوئی بھی ہو
جو دل لگا کر کرے کوئی' تو
ضرور وہ کامیاب ہوگا
جو اس میں ہے کوئی ہچکچاہٹ
تو کوئی ایجنسی ہی نا لے لیں
کریں وہ بزنس کہ جس سے دولت زیادہ تر اور جلد آئے"
وہ ہمسفر رہگذر کی دلبر
فسوں طراز اور ناز پرور
نئے خیالوں میں کھوئی کھوئی نئی تمناؤں میں سموئی
عجیب تسکین پا رہی تھی

ہے کالکا کے قریب ہی اک مقامِ رنگیں
وہاں جو رُکوائی اُس نے ٹیکسی

خرید کر کچھ اچار مُرغے کا اُس نے کھایا
اور اپنے ساجن کو بھی کھلایا
مزے مزے میں
اچار ہی کھائے جا رہی تھی
وہ اُس کا ساجن، رسیلا راجن
خموش، مدہوش، رنگ رسیا
وہاں خریدی شراب کی ایک بوتل اُس نے
اگرچہ اُس کو نشے کی خاطر شراب کی تھی نہ کچھ ضرورت
کہ اُس کو پہلے ہی کامنی کے نیّن کا نشّہ چڑھا ہوا تھا

تو کالکا میں وہ زندہ دل کامنی اور اُس کا نشیلا ساجن
جدا ہوئے مجھ سے لیکن اب تک
مرے دل و جاں میں گھومتے ہیں
مرے تخیّل میں جھومتے ہیں
چھبیلی البیلی نازنیں، جگمگانے اور مسکرانے والی
مری اُداسی پہ چھا رہی ہے
مرے تصوّر میں آج بھی مُسکرا رہی ہے

○

تیرہ گمرہا خشک پتّے

راہ چلتے اُونگھتا ہوں
پاس میں بھی آس کے پھولوں کی خوشبو سُونگھتا ہوں
جانے کتنے دن اور یونہی
منتظر رہنا پڑے گا
کربِ دل سہنا پڑے گا
تیرہ گمرے کا تفکّر بن گئی شامِ جوانی
آرزو کا بانکپن ہے اب کہانی

کیا ستم ہے پیڑ کورہ رہ کے فرطِ فکر میں بھی
واسنا کے خشک پتّے چھیڑتے ہیں

کھڑکھڑاتے خشک پتّے بھی پون کے پیار سے لہرا اُٹھے ہیں
سوئے احساسات پھر مُسکا اُٹھے ہیں

سوچتا ہوں جو مری قسمت نہ بدلی
کیا کروں گا
تا بکے بیکل رہوں گا
سوچتا ہوں دل اکیلا
کیا یونہی دُبدھا کے ساگر میں بہے گا
تیرہ کمرے کا تفکّر کب تلک ساتھی رہے گا

○

نیرو اور اُس کی موسیقی

مجبوبہ مشکوک ہوئی تو
سلطانِ جابر نے اُس کو قتل کرایا
اُس کی لاشِ عریاں کو چھت سے لٹکا کر
بھوکے کتوں سے نُچوایا
پیاسی کی آس کی ماری، بے جان آنکھیں
جنگلی کوؤں کی بے حس چونچوں نے نوچیں
ایسے ایسے ظالم بھی دنیا میں آکر
اس دھرتی کا بوجھ بنے ہیں
جن کو انسانی، حیوانی چیخوں میں بھی
موسیقی کا لُطف آتا تھا

جیسے اُن کو اپنی موت نہیں آنی تھی

بچّہ، بوڑھا، عورت اور اک جنگلی بلّا
بھیڑیا، مرغا، کُتّا، گھوڑا اور اک بکرا
یہ سب، انساں اور حیواں لوہے کی زنجیروں میں بند تھے
اور سلاخوں سے پِٹتے تھے
اور نیرو اور اُس کے ساتھی
اِن کے گرد خوشی سے ناچتے گاتے رہتے
موسیقی کی تیز دُھنوں کے ساتھ اِن جانوروں کی چیخیں
انسانی حیوانی آوازوں کا سنگم
'ایک سماں سا بندھ جاتا تھا'
جب تک یہ سب قیدی پیہم تڑپ تڑپ دم توڑ نہ جاتے
ظالم، اِن کے شور و شیون سے گیتوں کا لُطف اٹھاتے
جیسے اُن کو اپنی موت نہیں آنی تھی

آج کہاں ہے نیرو اور اس کی موسیقی

ماہتی میلہ

ننگے اجسام کا میل
ننگے اجسام کا کھیل
باوفا دوشیزائیں
چھوڑ کر حسن کا شرمیلا پن
ننگے سینوں میں لیے کام اگن
نشّے میں غرق جوانوں کے سنگ
جنس کی پیاس بجھانے میں مگن

اور شولنگ کی سنگت زنگت
کیک تیار ہوئے

ساتھ اُن کے ہوئی تقسیم حشیش
بے دھڑک جسم ملن شوخ تماشا گہ میں
مست، آزاد امنگ
انگ اور رنگ ترنگ
فطرتِ عیش آہنگ
جو ہے تہذیب سے آمادۂ جنگ

گھاس میں سانپ مچلتے ہی رہے
ننگے اجسام کا کھیل
ننگے اجسام کا میل

○

اِخلاص

"تم اتنے ریاکار کیوں ہو
کچھ اخلاص بھی تو دکھاؤ"

سو میں ایک دوشیزہ کے ساتھ اک رات سویا
وہ دوشیزہ جس نے کئی مندروں سے
کئی بُت چرائے تھے کرشن اور بُدھ کے

حشیش اُس کا مشرب تھا اور خود فروشی بھی اِس کے لیے تھی

○

ہونا

صبح اُٹھنا رات سونا
زندگی اب رہ گئی ہے بن کے 'ہونا'
جو بھی پایا، اُس کو رفتہ رفتہ کھونا

پاس ہی سوئی ہوئی ہے
بے حس و بیزار بیوی
باوفا و بے محبّت
پیکرِ ایثار، ذی پندار، دُنیا دار بیوی
گھر گرہستی کو سنبھالے
اپنے ارمانوں کو درمانوں کے پیمانوں میں ڈھالے

عُمر بڑھتی جا رہی ہے
سوچ کی دیوار چڑھتی جا رہی ہے
زندگی اب رہ گئی ہے بن کے ہونا
صبح اٹھنا، رات سونا

کیبرے

پھر اُس نے کپڑے اُتار پھینکے
وہ اپنے پستاں مسل رہی تھی
مچل رہی تھی
مگر کوئی اہلِ انجمن میں ہوا نہ حیراں
وہ پُرادا تیز رقص اُس کا
نشاط انگیز تیرگی میں وہ نور آمیز عکس اُس کا
تناستا کر لُبھا رہا تھا . . .
تو پھر ہُوا یوں کہ ایک رنگیں لکیر سی تیرگی میں چمکی
ہوئے تھے سب لوگ مست و بے خود

یہ کیفِ شب ہی ہے حسنِ اندازِ دوش و فردا
یہ منظرِ دلنواز ہے رازِ آدمی کی طبیعتِ معصیت گرا کا

اعداد و شمار

دلّی میں کتنے کوّے ہیں
بھارت میں کتنے چیتے ہیں
دُنیا میں اب شیر ہیں کتنے
ساگر میں اب کتنے مگرمچھ
رہ گئے باقی

غالبؔ کے کتنے بچّے تھے
کیا اُس کی بیوی جھوٹی تھی
کیا اُس کے ناقد سچّے تھے
اُس نے کتنے شعر کہے ہیں
کتنی غزلیں، کتنے قصیدے
اُس کا ذوقِ خامہ فرسا

کتنے بدکیشوں پر برسا
کتنے شاگردوں کو اُس نے
نامے لکھے

گاندھی کے من کی آندھی نے
کتنے اونچے پیڑ گرائے
اُس نے کتنا لیش پایا ہے
اب ہیں اُس کے کتنے پیرو
اُس نے کتنے دھوکے کھائے

غالب کے شعروں کی خوشبو
گاندھی کا اندازِ دلجو ——
اِن باتوں سے مجھکو مطلب
میرا تو تحقیق ہے مشرب
اعداد اور شمار ہے مذہب
سوزِ دروں کا اور فسونِ فن کا لطف اُٹھا نہیں سکتا
میں ہوں اپنے فن میں یکتا

کیفِ تنہائی

آگئی مجھ کو راس تنہائی
اب نہیں ہے اُداس تنہائی
کُنجِ عُزلت میں شغل ہے میرا
میرؔ و غالبؔ سے گفتگو کرنا
ہیں انیسؔ و دبیرؔ میرے انیس
اور چکبستؔ و پریم چند جلیس
تذکرے ہیں مسرّت و غم کے
سعدیؔ و حافظؔ و نظیریؔ سے
سُورؔ و تُلسیؔ سے راس لیلا ہے
سوچ کا رُوپ کیا رسیلا ہے

گیت گاتا ہوں کالیداس کے ساتھ
کیا خزانہ لگا ہے میرے ہاتھ
کیٹس کا ذہن چومتا ہوں میں
ییٹس کے ساتھ جھومتا ہوں میں
فکر و احساس کا ہوں دیوانہ
ایلیٹ سے ہے میرا یارانہ
بحث کرتا ہوں میں ارسطو سے
تر و تازہ ہوں اُس کی خوشبو سے
شیکسپیئر سے ہے شناسائی
آ گئی مجھ کو راس تنہائی

○

غضب اور عجب

زنِ بدکار کو اک ریچھ اپنے دائیں پنجے سے
طمانچہ مارتا تھا اور وہ بے ہوش ہو جاتی
پھر اُس کے پیرہن کو پھاڑ دیتا تھا
وہ بے بس اور عُریاں جسم، رومن دیکھتے تھے، جھوم اُٹھتے تھے
تو پھر خونخوار، بھوکے شیر اس کو نوچ لیتے تھے
غضب رسمِ عقوبت تھی

سُنا ہے جاوا، ٹاپو میں
ابھی تک، دھان کے پودوں میں جب بھی بالیاں نکلیں
تو مالک اور اُن کی بیویاں دونوں ہی ننگے ہو کے اپنے اپنے کھیتوں میں
کئی چکّر لگاتے ہیں
پرانے دَور میں یورپ کے باشندے تو عمدہ فصل پیدا کرنے کی خواہش میں اپنے اپنے
کھیتوں میں
جواں جنسی ملن سے رنگ بھرتے تھے
عجب رسمِ زراعت تھی
عجب طرزِ محبّت تھی

اختلاط

کھلتے جانے میں ڈھانپتے جانا
لپٹے لپٹے ہی ہانپتے جانا
ظاہری سا ہے یہ ملن کا رُوپ

در حقیقت ہے اختلاط وہ سوز
ذہن و دل بھی ہوں جس سے کیف اندوز
ہے ملن وہ مقام صُوفی کا
جو کہ رنگِ دوئی نہیں سہتا
جب انا درمیاں نہیں رہتا
وصل ہے اصل میں فنائے انا

مرکزِ کائنات ذات نہیں
منتہا ذات کا ثبات نہیں
سفرِ ذہنِ ذات خواہشِ وصل
نفیِ ذات جس کی منزل ہے

وفادار

یہ ہُوا کتنی ہی بار

دلِ بے تاب میں لے کر نئے احساس کی پیاس
جب کسی دوسری عورت کے پاس
شوق سے جاتا تھا مَیں
چاند ابھرتا ہی نہ تھا، بادل سے
'کام' ناکام ہی رہ جاتا تھا
نفسِ اَمّارہ کا
سر پہ الزام ہی رہ جاتا تھا
تجربے تشنہ رہے

ہار کر، آخر کار
یاترا پہلی ڈگر پہ ہولی

دُور لہراتا ہے اُس بیتے سمے کا آنچل
ایک موہوم سا منظر مِرے دل کے اندر
چٹکیاں لیتا ہے، مُسکاتا ہے
ایک مچلا ہُوا 'مَیں'
اپنے ہی گھر میں گرفتار رہا
کتنا ناتجربہ کار اور وفادار رہا

O

چڑھتا سُورج

راہ میں ایک شوخ دوشیزہ
مست انجانے چُلبلے پن میں
چڑھتے سورج کو ہاتھ میں تھامے
نُورِ احساس و فکر پھیلائے
ہر قدم پر ادا سے لہرائے
رنگِ حیرت بکھیرتی جائے

○

طنز

یہ حقیقت ہے کہ ہم چاند پہ جا پہنچے ہیں
اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ لاکھوں انساں
اپنی دھرتی پہ ہیں بھوکے، بے حال
یہ جگر دوز حقیقت کہ ہے دھرتی کا ملال
اُس دل افروز حقیقت پہ کیا
اک حزیں طنز نہیں؟

○

مشغلے

ہل چلائیں سوکھے کھیتوں میں جونگی عورتیں
اِندر ہو جاتے ہیں خوش یہ شوخ منظر دیکھ کر
اور بُجھا دیتی ہے پھر ورشا (رُتو) تو دھرتی کی پیاس
کتنے بے بنیاد ہیں وہم و قیاس
جھوٹی ہے مانو کی آس اور من اُداس

اِس لیے
ڈھونڈ ہی لیتا ہے وہ
حیرت آگیں مشغلے
دل لگانے کے لیے
دُکھ بھرا جیون بتانے کے لیے

○

استعارے

فرانسیسی حسینائیں
کبھی پیتل کی انگیائیں پہنتی تھیں
اُتاری جاتی تھیں سونے سے پہلے جب یہ انگیائیں
تو ان کو، سُرخ جلتے کوئلوں سے بھر کے اپنی چارپائی کے سرہانے کھونٹیوں سے باندھ دیتی تھیں

وہ ایسے اپنے بستر گرم رکھتی تھیں
اسی کارن کہا کرتے تھے لوگ انگیاؤں کو ہیٹر
اسی باعث کہا کرتے تھے پستانوں کو انگارے

مذہب اور جنسیت

مذہب نے جنسیت کو
بس دے کے مارنے کے
کتنے جتن کیے ہیں
لیکن نہیں مری یہ

گو جنسیت ہے زندہ
یہ بن گئی درندہ
رس اپنا کھو چکی ہے
زہریلی ہو چکی ہے

(ماخوذ از نطشے)

رات یہ میں نے خواب میں دیکھا
میرے آنگن کے دونوں ہی پیڑ کھڑے تھے
حیراں، ساکت
ایک کی شاخیں سانپ بنی تھیں
جن کے منہ سے
کتنے سورج اُبھر رہے تھے

اور اک بالکل سوکھ گیا تھا

استحصال

دُودھ کا رسیا ہے سانپ
اپنے حلقے میں جکڑ کر بے خبر عورت کا جسم
چُوس لیتا ہے سراسر اُس کے پستانوں سے دودھ
جب کبھی پا لیتا ہے وہ تنہا، اُسے

دھرتی پر کتنے ہی ایسے، دودھ پینے والے سانپ
پل رہے ہیں، پھولتے پھلتے ہیں، جن کو دیکھ کر
میرا دل جاتا ہے کانپ

زباں کھُردری ہی رہے گی

ہمیں حُسن سے پیار ہے اور رہے گا
مگر ہم غلُو سے نہیں کام لیں گے
ہمیں دل کی باتیں ہیں مرغوب، دل اپنی باتیں کہے گا
مگر یہ زباں کھُردری ہی رہے گی
کہ ہے کھُردرا یہ تمدّن

زباں کھُردری ہی رہے گی

○

اک دُور اُفتادہ ٹاپو میں

اک دُور افتادہ ٹاپو میں
پستانوں پر زرّیں خول چڑھانے والی دوشیزائیں
(ایک ادائے شوخ ہے یہ تزئینِ بدن کی)
کاروبارِ عشق کی رسیا
ہر پردیسی کی من بسیا
اِن خوبوں کا مول چکا کر
نازو ادا کی قیمت پاکر
اپنے جوبن، اپنے ملن سے
چنچل من کو بہلاتی ہیں

وہ غیروں کی بات نہ سمجھیں
غیر بھی اُن کی گھات نہ سمجھیں
لیکن اُن کے جسم زباں ہیں
پیار کی بولی، کام کی بولی
غیرت، حیرت کا پیراہن زیبِ تن کر کے مُسکائے
'کام' کی موجوں پر لہرائے
کام کی بولی سے البیلی دوشیزائیں
مچلے پردیسی شوقینوں کے جیون کو بھرماتی ہیں
مہکاتی ہیں۔

○

قلوپطرہ کی موت

مرمریں سینے پہ مارا ڈنک "زہری" ناگ نے
اور نکلا قطرۂ خوں، نیلگوں، آئینۂ سوزِ دروں
نیل کی ناگن نے اپنے آپ کو ڈسوا لیا
(حُسن کی قاتل ادا)
گر گئی وہ اپنے گھائل دوست کی آغوش میں
اور بحرِ مرگ کر کے پار دونوں زندۂ جاوید ہو کر رہ گئے
عاشقی کی ایک لافانی کہانی کہہ گئے

○

شرطِ شادی

ہے دنیا اک عجائب گھر

کئی لوگوں کے لچھّن کیا چھبیلے ہیں

ابھی تک روے گیتی پر کچھ ایسے بھی قبیلے ہیں

کہ جن میں لڑکیوں کے واسطے شادی سے پہلے بچّے جننا شرطِ شادی ہے

اگر جنسی ملن کے بعد محبوبہ نہیں پھلتی

تو اہلِ عشق میں شادی کی بات آگے نہیں چلتی

○

یادِ ملن کی

(کام لہر کی نظم)

ملن جیون ہے، اس کا بانکپن، اس کی حرارت ہے
محبت کی شرارت ہے

وہ گردن، شوق کا درپن، ہوس کی شوخ بوسہ گاہ
نشاطِ عشق کی شہراہ

وہ آئینہ نما سینہ
سُرورِ دل کا گنجینہ
وہ گرم و مرمریں رانیں
مچلتے 'کام' کی کانیں

مری چاہت میں وہ تیور، وہ صولت ہے
کہ ننگے جسم کی لذّت مری راتوں کی دَولت ہے

○

تتلیاں

یہ پشیمانی میں حُسنِ شبنمیں
تیرے شانوں پر ڈھلکتی شال، رنگیں، ریشمیں

ہر طرف ہیں جلوہ گر
تتلیاں، کیفِ نظر
یہ فضائے شوخ کے ذی جاں گہُر
اُڑنے والے پھُول ہیں، یہ تتلیاں
نامہ برِ احساس کی،
نرم، بوقلموں علامت زندگی کی آس کی
ہے کشش آمیز اِن کا بانکپن

رات دن ہوتا رہے
نکہتوں کی سیج پر اِن کا ملن

ننگا احتجاج

[STREAKERS]

کالجوں میں پڑھنے والے شوخ لڑکے، لڑکیاں
گرم، بے بس قہر میں
ہو کے ننگے دوڑتے ہیں رہگذاروں میں، ہجومِ شہر میں
ہے یہ روز افزوں گرانی کے خلاف
احتجاجِ زیرِ ناف
جیسے تاجر، بڑھتے نرخوں کے پیامی، خودغرض، بے دھرم ہیں
ویسے ہی یہ نوجواں، آوارہ فطرت، گرم ہیں، بے شرم ہیں
تیاگ دی ہے لوک لاج
ہے یہ کیسا احتجاج
کھو گئی ہے ان کی غیرت، شہر کو غیرت دلانے کے لیے
سو گئی ہے عقل اِن کی، دوسرے لوگوں کو غفلت سے جگانے کے لیے

سرد سنّاٹا اور لُو

سرد عورت، بے حس و بے آرزو
اور اُس کے روبرو
تُند، مردانہ ہوس
گرم خوں اور کام رس
گرم خُو اور کامجُو

چھیڑتی ہے سرد سنّاٹے کو لُو

○

پیاسی

آخر ش ٹوٹا طلسمِ انتظار
میں مگر تشنہ رہی
میرا اتمرسا پیار نفرت بن گیا
میں نے اس کو مار ڈالا دفعتاً
ورنہ خود کو مار دیتی —— رات کو
وہ مری اُمّید پہ پورا نہ اُترا، مجھکو پاگل کر گیا

○

پچاس اور پچپن

دانت ٹوٹے ہیں مگر
پھر بھی وہ عمرِ گریزاں سے لڑا کرتا ہے
ہاتھ ہر روز کھڑا کرتا ہے

اُس کے دو بیٹے ہیں اور دونوں ہی امریکہ میں
اور اک شادی شدہ بیٹی ہے

گھر میں اب کوئی نہیں اور، فقط ایک میاں اور بیوی
اُن کی تنہائی بڑھاتی ہے ہوس کا کس بل
روز ہو جاتا ہے موسم چنچل

لذتِ جسم اُٹھاتے ہیں پچاس اور پچپن
مرمریں رانوں کی محراب ہے ہر رات اُن کی
جیسے لوٹ آیا ہو مچلا بچپن
جیسے لہرائے نشیلا جوبن
وہ شرارت، وہ حرارت وہ تپش
اُن کے چہروں پہ ابھی
'کام' مسکاتا ہے
آج بھی شدّت سے
اُن کے جسموں کی اگن بھڑکی ہے
ایک لڑکا ہے تو اک لڑکی ہے

○

ننگا نگر

پیرس سے سو میل جنوب میں ایک نگر ہے
جس کے جیون رنگ کی البیلی ہی ڈگر ہے
جس کے باسی رہتے ہیں روز و شب ننگے
اُن کا مذہب ہے عریانی
یعنی
ایسا جامہ پہنیں جس کا
سیدھا اُلٹا کوئی نہیں ہے
بازاروں میں ننگے گھومیں
ننگے کاروبار چلائیں
میخانے میں ننگا ساقی ننگے رند مچائیں دھومیں

پیار کے سودے، برلبِ رودے
ننگے جھومیں سرمستی میں
تن پوشی جُرم اُس بستی میں
مَرد و زن کا ننگاپن فطرت کی پھبن ہے
رنگِ شرافت اُس ننگی بستی کا چلن ہے
شیطانی تو نہیں عریانی
اُس بستی سے برسوں بعد بھی آئی نہیں ہے
اخلاقی بے راہ رَوی کی کوئی خبر، جے ننگانگر کی
جے ہو اہلِ ننگانگر کے حُسنِ طبیعت، حُسنِ نظر کی

○

عوامی مسخرہ

"عوامی مسخرہ ہوں میں
جسے دُنیا نے اک فنکار گردانا"
کہا ہے یہ پکاسو نے
کبھی سُقراط نے بھی ایسے ہی کچھ شبد بولے تھے
کہ "میں یہ جانتا ہوں، جانتا کچھ بھی نہیں ہوں میں"

کسی اعلیٰ مفکّر نے
کبھی خود کو نہیں مانا ہے لاثانی
نہیں اپنی ستائش کی
طریقِ انکسار و عجز فکر و فن کا شیوہ ہے
یہی ایثار ہے فنکار کی عظمت

"عوامی مسخرہ ہوں" "جانتا کچھ بھی نہیں ہوں میں"
تو ان شبدوں کا مطلب کیا
وہی ہے جو بظاہر ہے!

چارواک ــــــ مادہ پرستی کا پیغامبر

یہ سب دھارمک پُستکیں ہیں غلط، دفترِ افترا ہیں
یہ احمق، یہ نادان پیرو اسیرِ فریب و دغا ہیں
برت اور بھکشا

دعا و ریاضت میں رکھّا ہی کیا ہے
کہاں یہ، کہاں خوبصورت جواں عورتوں سے بغل گیر ہونے کی لذّت
وہ مخمور آنکھیں، وہ مغرور سینے
سکھاتے ہیں جو زندگی کے قرینے
نشاطِ ہوس کے علایم ـــــ یہی رازدارِ بقا ہیں

دیوی

جنم کنڈلیاں دیکھ کے، سخت چناؤ رچ کے
کھٹمنڈو میں ایک ایسی بچی کو جس کے جسم پہ کوئی داغ نہ ہوتا
جرأت مند و دلدار و دلجو ہوتی جو
چار پجاری اپنے دیش کی دیوی چنتے
سب اہلِ نیپال اُس کی پوجا کرتے تھے
شوکت اور عظمت کا پیکر ——
دیوی کھٹمنڈو کے عالی شان، حسیں مندر میں رہتی
نوکر چاکر اور پجاری اُس کی سیوا کرتے رہتے
بھگت اُسے نذرانے دیتے
اُس کا پاون جیون ہرش کا مخزن ہوتا

لیکن شرط یہ تھی وہ دیوی اپنے اور کسی کے جسم سے ہرگز خون بہا نہ سکے گی
اس کارن ہی اُس کا چناؤ بچپن ہی میں ہو جاتا تھا
دیوی جونہی تیرہ چودہ سال کی ہوتی

چار پُجاری نئی 'کماری' کو پھر دیوی چُن لیتے تھے
اور پُرانی دیوی' بعد میں اپنا جیون
رو رو کر کاٹا کرتی تھی

زار و تنہا
وقفِ رنج، اجیرن جیون
لوگوں کا وشواس یہ تھا جو مرد ایسی دیوی سے شادی کر لے! جلد ہی مر جائے گا

وہ دیوی کل جس کی ذات پرستیدہ تھی
آج تھی ناپُرسیدہ' وائے رسمِ زمانہ

سورگ اور نرک اِس جیون ہی میں مِل جاتے ہیں
جیسے دیوی کا بچپن اور اُس کی جوانی
عظمت کی ہے کتنی درد انگیز کہانی

○

ایسے بھی کچھ دیش ....

ایسے بھی کچھ دیش ہیں اِس دھرتی پر جن میں اکثر
البیلی دوشیزاؤں نے اپنے دیش کی خاطر
اپنی عصمت کے گوہر بھی لٹائے

ایسے بھی کچھ دیش ہیں اِس دھرتی پر جن میں اکثر
چند جواں، ملّت کے رہبر بن کر
خود کامی میں دیش اپنا بیچ آئے

○

ڈگمگ ڈگمگ

جگمگ جگمگ ننگے جسم
کیف، طلسم
ناز، نزاکت، نخوت، شان
دُنیا دار انسان تو کیا
ڈگمگ ڈگمگ سادھو سنتوں کا ایمان

○

ریشماں کے پیرہن

آجکل دُنیا میں ہے فیشن کا راج
کھو چکی ہے رعب اپنا، لوک لاج
مغربی دیشوں کی رنگیں عورتیں، شوقیں مزاج
جن کے گورے جسم ہیں اصنامِ عاج
ریشماں کے پیرہن پہنے ہوئے
گھومتی ہیں شاہراہِ شہر میں
جھومتی ہیں، کامنا کی لہر میں
گرم خُوں، شعلہ بدن
انجمن در انجمن
واپسی فطرت کی جانب، خوبرویوں کا چلن
ہر طرف جلوہ فگن
رنگِ فطرت کی پھبن
جس کے ہیں آئینہ دار
ریشماں کے پیرہن

جلادو محرموں کو ....

جلادو محرموں کو توڑ دو بندھن
کہ اب ہم عورتیں آزاد ہیں مردوں کے چنگل سے
یہ مردانہ ہوس کا بَل
(ہمیں تسخیر کرنے کے لیے بیکل)
نہیں تھا اپنے آپے میں
مگر اب اپنی حد پہچان پایا ہے

نہیں بس جنسِ کی لذّت کے ساماں ہم
حقوقِ جنس کی خاطر
ہمیں مَردوں سے لڑنا ہے
اور اُن کے سر پہ چڑھنا ہے
کہ وہ پہچان لیں اپنی حقیقت کو
اُتار دو یہ روایت رنگ پیراہن
کہ عُریانی بھی آزادی کی مُظہر ہے
جلادو محرموں کو توڑ دو بندھن

ڈریکولا

راتوں کے سنّاٹے میں
سوئی دوشیزاؤں کے رُخساروں پر
گاڑ دیا کرتا تھا اپنے خونیں دانت ڈریکولا
پی جایا کرتا تھا خونِ گرم اُن کا
یورپ کے اک دیش کے اِس خونخوار و بے حِس سُلطاں کو
ولدِ شیطاں کہتے تھے
تُرکوں کے حملے سے بچنے کی خاطر
اُن کو ڈرانے کی یہ اچھوتی ترکیب اُس کو سوجھی تھی
اُس نے ہزاروں لوگوں کے سر کاٹ کے اپنی سرحد پر گاڑے بانسوں پر لٹکائے
دیکھ کے یہ، جنگل کے وحشی شرمائے
کیسے کیسے ظالم دھرتی پر آئے

کہتے ہیں جب کوئی بھکاری اُس کے قابو آجاتا
اُس کو اپنے محل میں لاتا اور مکلّف کھانا کھلا کر نذرِ آتش کر دیتا
قتل ہوا آخر وہ قاتل بھی
تُرکوں نے اُس کا سر قسطنطنیہ بھیج دیا
اُس کی بے سر لاش بھی غائب ہو گئی تربت سے

ہے یہ وہم، ڈر بگولا
بعدِ موت بھی سوئے ہوئے لوگوں کا خوں پیتا ہے راتوں کے سنّاٹے میں

اپنے ظلم سے دھرتی کو جھنجھوڑ گیا
اک وحشی، لوگوں کے دلوں پر نقشِ دہشت چھوڑ گیا

○

بعدِ تغیرِ جنس

اپنے دیرینہ ہم جماعت سے
جو کہ ہم جنس تھا کبھی اُس کا
اشتیاق و تپاک سے، اُس نے
بعدِ تغیرِ جنس، شادی کی
دوستی کتنی باوفا نکلی
کہتے ہیں پچھلے جنم میں یہ مرد
اِسی بیوی کی پیاری بیوی تھا

ہے مقدر تو ہو رہے گا میل
کرشن موہن ہے یہ عجب لیلا
میل بھی جنم جنم کا ہے کھیل

تین ردِ عمل

کسی حسینہ کی لاش کو دیکھ کر ہوس کار سوچتا ہے
مباشرت اُس کے ساتھ کرتا
اور ایک کُتّا
اُسے فقط کھانے کو ہے کوشاں
مگر کوئی سنت دیکھ کر اُس کو، پرارتھنا اُس کی آتما کے لیے کرے گا

○

بے فکری

یہ اک چینی کہاوت ہے
کہ نبضِ تیز، اچھا خانساماں، خوبرو بیوی
ہیں اسبابِ قوی، بیماریِ دل کے

تو یہ بہتر ہے اِن اسباب سے بچ کر گذر شہراہِ ہستی سے
بسر کر زیست بے فکری سے، مستی سے

○

اُجّین کے مندر

آج بھی ہیں اُجّین میں ایسے مندر جن میں
بھوگ لگا کر مورتی کو مدِرا سے، مدرا کا پرساد دیا جاتا ہے
ایسا اک مندر ہے جس کے بل بوتے پر
ایک پجاری، دس کُتّے اور صدہا کیڑے
پلتے، پھولتے اور پھلتے ہیں
کہتے ہیں راجہ وکرم نے
بھیرو کال کے اس مندر میں
تنتر یوگ کے سادھن سے سِدّھی پانے کی پُوجا کی تھی

ندی کنارے ایک ایسا مندر ہے جس میں

مہا کال کی مورتی پر، روزانہ پو پھٹنے سے پہلے
تازہ، گرم چِتا کی راکھ رما کر آرتی کی جاتی ہے
کالیداس کا وہ مندر بھی ہے اُجّین میں ——— ٹوٹا پھوٹا
جس میں اُس نے اپنی پتنی کے کہنے پر
اپنے جہل سے چھُٹکارا پانے کی خاطر
کالی ماں کی پوجا کی تھی
جس نے اُس کو کویتا کا وردان دیا تھا
آج اُس مندر میں چمگادڑ کریں بسیرا
جیسے ہو بھوتوں کا ڈیرا
یہ مندر ہے اننت کا درشن
کالی اندھیرا

○

اکیلاپن

... کہ تنہائی جغرافیائی نہیں ہے
اکیلا نہ تھا دشت و صحرا میں بھی مَیں
مگر انجمن میں
حسیں پیرہن عورتوں اور مردوں کے مابین اکیلا رہا ہوں

○

نسخۂ درازیِ عُمر

جواں عورتوں کے تنفّس کی خوشبو
فسوں خیز و دلجو
بڑھاتی ہے عُمرِ عزیز اور دیتی ہے چاہت کی راحت
پرانے زمانے میں وشواس تھا، اہلِ عشرت کا احساس تھا یہ
کہ تسکینِ نفسی ہی رازِ بقا ہے

کسی نے بنایا تھا یورپ میں اک بسترِ صندلیں بھی
ہوس خیز، موسیقی و نکہت و قوّتِ برق کا امتزاج، ایک شہکارِ لذّت
بدن کی عبادت
حسیں لڑکیوں اور بزرگوں کی ہمبستری ـــــــ زیست افزا

عجب شغلہ تھا

سُنا ہے کہ اک قبر پر روم میں تھا یہ کتبہ
"یہ ہرمپ ہے جو ایک سو بیس ورش اور چھ دن جیا
خوبصورت جواں عورتوں کے تنفس کی خوشبو کے
باعث —— حکیموں کی حیرت، گذارو یونہی زیست اپنی"

○

ساگر کے نیچے

سیدھی سادی سوچ کے اندر کتنے تیور پنہاں ہیں
ساگر کے نیچے ہیں جنگل اور پہاڑ
بھرے پُرے بھی اور اُجاڑ
سلسلہ وار
اندر کتنا اوبڑ کھابڑ باہر ہے کتنا ہموار

○

اموِرت کلا

اظہار اتنا بے باک ہُوا
ادراک اذیت ناک ہوا
ترسیل اک "سپنا جھیل" بنی
ابلاغ کا دامن چاک ہوا

آہنگِ حُسن بلا بن کر
اک نامحسوس خلا بن کر
اب ذہن و دل پر چھایا ہے
رنگ ایک اموِرت کلا بن کر
دُھندلاہٹ میں لہرایا ہے

○

جُھوٹھن

بمبئی کے ہوٹلوں میں
بھک منگوں کے واسطے بکتی ہے جُھوٹھن

بھوک لیتی ہے سمیٹ
پچھلے دروازوں سے لے لو، مطبخوں سے
تیس پیسوں میں پلیٹ
نظم چھپنے تک، مجھے ہے یہ ہراس
ہو رہے گی یہ پچاس
وہ بھی آجائے گی راس
ہر کسی کو پالنا ہے اپنا پیٹ

○

میڈیم

یہ نہ سمجھو کہ یہ زیست کا داغ ہے
"جنس" اظہار ہے، حُسنِ ترسیل ہے، لُطفِ ابلاغ ہے
یہ تو انگ انگ کا دل نشیں رنگ ہے
ایک آہنگ ہے، پیار کا سنگ ہے
جنم داتا فنونِ لطیفہ کا، یہ جذبۂ آتشیں
شاہکارِ زمیں
خوب سیرت ہے یہ، خوبصورت ہے یہ

بے کدورت ہے یہ
آئینہ دارِ کیف و نفاست ہے یہ
درحقیقت امینِ لطافت ہے یہ
جسم کا، جو طلسمِ بقا ہے، اُسے
ترہیبا جنس دے
جنس تو زندگی کی ہے تابندگی
زیورِ زندگی
رونقِ باغ ہے، نُزہتِ راغ ہے
یہ نہ سمجھو کہ یہ زیست کا داغ ہے

ریچھ

لوگ کہتے ہیں کہ میں اک ریچھ تھا پچھلے جنم میں
جانور زندہ ہے اب تک
میری جنسی بھوک تابندہ ہے اب تک
کامنا کے جال کتنے
بے پروبالی میں گذرے میرے ماہ و سال کتنے
جسم پر ہیں بال کتنے
جو پسند آئیں "مساقی" عورتوں کو
اور مجھ کو چُبھ رہے ہیں
"ساویت" ہے میرا مشرب
لذتِ ایذا دہی سے جھومتا ہوں
چاہتا ہے من، ملن ہونت نئی رس کامنی سے
شوخ مچلی دامنی سے

بات کومل گات کی ہے
رات چنچل مات کی ہے
'کام' کی رجنی کالبیا
گیان رسیا
بھوگ کے بس میں ہے جوگی
ضبط سے ناآشنا سا
ریچھ کے مانند، بار ادا اسنا کا
کام لہریں ہیں مری مٹی کے نم میں
لوگ کہتے ہیں کہ میں اک ریچھ تھا پچھلے جنم میں

○

رکت دان

کلوپٹرا نہاتی تھی غلاموں کے لہو میں سال میں اک دن
جوانی کے تحفظ اور قیامِ حسن کی خاطر
بشر خونِ بشر سے کیفیت اندوز ہوتا تھا
وہ کیسی قابلِ نفرت ادائے بربریت تھی

ہے یہ دورِ تمدن اور اس میں بھی
بشر خونِ بشر سے کام لیتا ہے
بشر خود اپنے خوں کا دان دیتا ہے
جو دینے اور لینے والے، دونوں کے لیے ہی زندگی افروز ہوتا ہے
وہ رنگِ بربریت تھا
یہ اعجازِ ثقافت ہے

تماشائی

ایک پاگل گھومتا تھا جھومتا تھا ہاتھ میں ڈنڈا لیے بازار میں
دیکھتے ہی دیکھتے
ایک سادہ راہرو کے سر پہ ڈنڈا اُس نے مارا زور سے
لوگ چونکے شور سے
اور پھر ہنسنے لگے
یہ تماشا دیکھ کر

○

سوریہ پوجا

عہدِ کہن میں
میکسیکو میں سورج کی پوجا ہوتی تھی
لوگوں کا وشواس تھا سورج کو ہر روز سفر کرنے سے پہلے شکتی کی ضرورت
اور یہ شکتی صرف لہو سے مل سکتی تھی
اِس وشواس کی خاطر سورج دیوتا کو انسانی قربانی دیتے تھے
روز سویرے لاکھوں کے مجمع میں ایک غلام کو معبد کی چوکھٹ پر
پانچ پجاری سنگِ قربانی پہ لٹا کر
خنجر گھونپ کے اُس کے تن سے کاٹ کے گرم، دھڑکتے دِل کو
پھینکتے تھے سورج کی جانب
سورج دیوتا کے بُت کے ہونٹوں پر خون کے چھینٹے دے کر

لاش غلام کے گھر بھجوا دی جاتی، جس کا گوشت پکا کر
سب گھر والے اور پڑوسی مل کر کھاتے اور سورج کے گُن گاتے تھے

خون دیا ہے، خون لیا ہے
سارے جانوروں سے بڑھ کر وحشی انساں نے وشواس سے
کیسے اپنا ناش کیا ہے

O

چکر پوجا

عجب تانترک رسم جسموں کا مِلنا
شبِ آرزو میں
برابر کی تعداد میں اجنبی مرد و زن ہو کے یکجا
ریاضت کا چکر چلا کر ملن بھوگ میں مگن ہوتے
وہ شکتی کی پوجا عجب تھی
کہ سب بیٹھ جاتے تھے اِک دائرے میں جسے چکر کہتے
اور اک چکر نیتا ہدایات دیتا
اکٹھا ہوئی عورتیں چولیاں اپنی اپنی
کسی ٹوکری میں قرینے سے رکھتیں
کہ جن میں سے ایک ایک چولی اُٹھا، چولی والی کو پا کر
اکٹھا ہوئے مرد پاتے ملن میت اپنے

شکستِ اوّلیں

سہاگ کی رات جوزفائن نے اپنے کُتّے کو بھی سلایا تھا سنگ اپنے
نپولین کو بھی اُس کی ضد ماننی پڑی تھی
مِلن سمے اس کی ٹانگ پر کاٹ بھی لیا تھا حسُود کُتّے نے طیش کھا کر
نپولین کی یہ سب سے پہلی شکست بستر پہ ہو گئی تھی

○

یتیم لڑکی

ایک بے حس اُجاڑ جنگل میں
سُوکھی، افسردہ جھاڑیاں، حیراں
چند کج مج ببانیوں کے پیڑ
دل کو جو چھیڑ ہی نہیں سکتے
اپنی بے مائیگی کے آئینہ دار
اپنے احساسِ عجز کا اظہار
جس کو سمجھے بزعمِ خود شہکار
مرگِ آہنگ و رنگ و نغمہ، حیف
نثری نظموں کی نثر بھی بے کیف

ایسا لگتا ہے پڑھ کے یہ نظمیں
رو رہی ہے کھڑی دوراہے پر
شاعری اک یتیم لڑکی ہے

... بال دانستہ سفید

کھینچتی تھی ہر کسی کو اپنے بھکتی رنگ میں
اک جوان و خوبرو عورت ملی ست سنگ میں
خوش ادا و خوش نظر، خوش طینت و خوش پیرہن
گیان رس میں محو تھی، اس کی اُمنگ انگ انگ میں

تاکہ اُس کے گیان میں بھکتی میں آجائے نہ بھید
اس نے کر ڈالے تھے اپنے بال دانستہ سفید

○

○

لے کے پہلو میں دلِ حسرت اساس
گھومتا ہوں بستیوں کے آس پاس

کربِ دوراں سے بھی دامن کش رہا
دل کو سوزِ عشق بھی آیا نہ راس

میری چنچل پیاس بجھتی ہی نہیں
میری بے کل آس ہے کتنی اُداس

ناچتا رہتا ہوں انگاروں پہ میں
شدّتِ احساس کا پہنے لباس

جس طرح صحرا میں صرصر کا عمل
یوں بسی ہے قلبِ شوریدہ میں یاس

کوئی اس کا ہمسر و ثانی نہیں
ساغرِ جم ہے دلِ دوراں شناس
مختلف ہیں رنگ، جوہر ایک ہے
ہو شکایت یا وفا کی التماس
یہ ملاحت، یہ ملن کا بانکپن
اور چمکاتا ہے میرے من کی پیاس
سوچتا ہوں، ذہنِ انسانی ہے کیوں
مائلِ تخریب، بے خوف و ہراس
ہے ہم آہنگِ شقاوت، تمکنت
زہر سے جس کے ہیں آلودہ حواس
کرشن موہن ہے یہ تیرا بھولپن
زہر میں بھی ڈھونڈتا ہے جو مٹھاس

○

یہ سرسراہٹ کہ سعیِ عرفانِ ذات جیسے
یہ لانبے لانبے درخت کرتے ہوں بات جیسے
یہ نین ہیں من کا چین، غم سے نجات جیسے
یہ رُوپ ہے سُکھ کی دھوپ، کیفِ حیات جیسے
اُداس ہو، محوِ یاس ہو کائنات جیسے
نہیں کوئی ایسا رنج، دل کی وفات جیسے
ہو ایک گمبھیر سوچ حُسنِ حیات جیسے
حیات اپنی خموش و تنہا، ممات جیسے
بنے گی ممکن فضائے ناممکنات جیسے
جنوں زدہ ہوں خرد کے یہ تجربات جیسے
حیات کے پیڑ کو ہے خواہش کی بھیڑ پیہم
امید ہے ڈال ڈال غم پات پات جیسے
کہیں نہیں ہے نشانِ منزل، اُداس ہے دل
یہ سلسلے سوچ کے، جُدائی کی رات جیسے
بہار میں کھل رہے ہیں پھول اس طرح چمن میں
دل و نظر پر کھُلیں رموز و نکات جیسے

وہ اک تعلق جو تجھ سے ہے اہتزازِ دل ہے
ترا تغافُل بھی ہو ترا التفات جیسے
تجھی پہ ہے منحصر وجود و عدم ہمارا
وصال تیرا حیات، فرقت ممات جیسے
چلے گئے ہیں وہ دفعتاً مجھ سے روٹھ کر یوں
ہوئی نہ ہو عشق میں کوئی واردات جیسے
جو رنگ کل تھا، ترس رہا ہے دل آج اُس کو
فنا نشاں ہوں حیات کے واقعات جیسے
کوئی بھی شے اپنے پہلے ہی رنگ پر نہیں ہے
ہو بس تغیّر ہی کو جہاں میں ثبات جیسے
حیات کی ناتمامیوں، تلخ کامیوں میں
یہ دردِ شیرینِ عشق شاخِ نبات جیسے
وہ جیت کر دل یہ کہہ رہے ہیں کہ پریت کیا ہے
یہ جیت کیا ہے، ہوئی ہمیں کو ہو مات جیسے
وہ رنگ جذبات میں کہاں اب ہے کرشن موہن
سُلا چکے اِن کو وقت کے سرد ہات جیسے

○

رنگ رسیا ذرا سنبھل کر چل
رُوپ کی دھوپ ہے بڑی چنچل

اُمڈا اُمڈا یہ سانولا بادل
شوخ رجنی کی آنکھ کا کاجل

اِس کے ہر روپ میں ہے رنگ نیا
زندگی بھی ہو جیسے ایک غزل

سوکھتا جا رہا ہے جسم کا پیڑ
ہے مگر سبز پیار کی کونپل

کیسے نپٹے ہوس کے طوفاں سے
اپنا من جو ہے اک کنول کومل

پھنس کے رہ جاتا ہے بشر اس میں
ہے یہ سنسار موہ کی دلدل

دامنی کا یہ چمپئی لہرا
کامنی یا منی کا ہے آنچل

آدمی جب سے جانور ٹھہرا
بن گئے ہیں یہ شہر بھی جنگل

غم کے سانپ اِس کے گرد لپٹے ہیں
میرے دل کا درخت ہے صندل

اشک پچھتاوے کے بڑے کام آئے
دُکھی دھرتی کا من ہوا شیتل

شوخ سورج کا سوانگ ہے سونا　　بھولے پاتال کی ہے پت پیتل
کس قدر ہوشیار ہے انساں　　زندگی کو ترس رہی ہے اجل
نین بے چین تھے مرے دن رین　　رہتے تھے تیری ہی لگن میں سجل
کھِل اُٹھا ہے ترے ملن سے من　　ہو گئیں میری کامنائیں سپھل
کیا ستم ہے کہ تیرا غم پا کر　　ہو گئے ہیں خوشی سے ہم پاگل
تیری شوخی میں ہے نشاطِ اَبد　　تیری معصومیت میں حُسنِ ازل
سہہ سکا کون دارِ فانی میں　　وقت کی تیکھی تیوڑیوں کے بل
ہم نے مانا کہ ناگزیر ہے موت　　زندگی کا بھی فیصلہ ہے اٹل
من میں بستے ہیں رات دن ساجن　　گرچہ آنکھوں سے ہو گئے اوجھل

ہم تو جوگی ہیں، وشو کے دُکھ سے
کرشن موہن ہے اپنا من بوجھل

○

ہم نے مانا، ہے ناگزیر اجل
زندگی کا بھی فیصلہ ہے اٹل

اصلِ کیف و نشاط ہے چھل بل
بے وفا ہے حیات کی ہلچل

اے دلِ زار بے قرار ہے کیوں
تجھ پہ وہ مہرباں ہے، سوچ، سنبھل

فکرِ فردا بھی چاہیے، ہر دم
سینۂ ماضیِ حسیں نہ مسل

اے حوادث کی آسیا تھم جا
میری چھاتی پہ اور مونگ نہ دل

اپنے کتنے ہی خیر خواہوں کا
یہ جہانِ خراب ہے مقتل

مفت کا اضطراب مول نہ لے
ہر نیا چہرہ دیکھ کر نہ مچل

زندگی ایک ایسی مشکل ہے
جس کا ملتا نہیں ہے کوئی حل

زیست کے چہرۂ نگاریں پہ
عملِ بد سے مت سیاہی مَل

کیا قیامت ہے عقل کے ہاتھوں
نوعِ انساں ہو گئی پاگل

وصلِ جاناں کی ہے تڑپ دل میں
زندگی ہو گئی ہے طُولِ امل

تیری آنکھوں میں ہے چمک ایسے
جھیل میں جیسے مُسکرائے کنول

ظرفِ انساں کا آزماتی ہے
زندگی ہے شراب کی بوتل

کہیں پہچان بھی نہ مشکل ہو
اِس قدر جلد بھی نہ رنگ بدل

دل کہ مدفن ہے آرزوؤں کا
فکر و احساس کا ہے تاج محل

ہر طرف ہے ترا فسوں طاری
تیری چاہت میں ہے جہاں بیکل

ہے نہیں پوچ ہر پرانی سوچ
ہر نئی سوچ بھی نہیں مہمل

گرچہ ہیں ہم قصور وارِ شوق
آپ نے پہل کی تھی پہلے پہل

بن گئی حُسنِ فکر کے باعث
میری آوارگی بھی حُسنِ عمل

کرشن موہن ہوس ہے ایک قفس
حلقۂ کید و فن سے جلد نکل

○

یاس وغم میں اے ملن کی آس کے آنسو چمک
عقل کی ظلمت میں اے احساس کے جگنو چمک

دل رہینِ یاس ہے، محسوس ہوتی ہیں اداس
چاندنی، شوخی، حیا، شبنم، ادا، خوشبو، چمک

پھیکی پھیکی، بے مزہ، بے نُور سی ہے زندگی
عشق کی شوخی دمک اے حُسن کے جادو چمک

اپنی چنچلتا سے میرے پیار کو چمکا گئی
تیرے البیلے، نشیلے رُوپ کی دلجُو چمک

ہار کر تدبیر نے تقدیر سے کہہ ہی دیا
مان بھی جا، میں تو جھکی ہوں بہت، اب تو چمک

زندگی میں ہو کبھی تو کوئی ہنگامہ بپا
جذبۂ آوارہ و شوخِ دلِ یکسو چمک

ایسے چمکاتا ہے قلبِ زار کو تیرا خیال
جیسے دشتِ تیرہ کو دے دیدۂ آہو چمک

چیرتا ہے بے حسی کی گہری ظلمت کو تجھے
اور ابھی اِس طور سے اے دشنۂ ابرو چمک

تیرے تیور زیورِ احساس ہیں، الماس ہیں
یاد کے کہرے میں سوز و کاوشِ پہلو چمک

اے فسونِ راز، جلوت ساز اے خلوت نواز
پیار کی آواز، پائے ناز کے گھنگھرو چمک

کرشن موہن کے دُکھی من پر اندھیرا چھا گیا
رُوپ کی دھوپ، اے برہ کے درد کی دارُو چمک

○

رات دن میرا من سلگتا ہے
سوچ کا شوخ بن سلگتا ہے

اتنی حدت ہے اب خیالوں میں
من تو کیا تن بدن سلگتا ہے

تیرے اعضا کی شعلگی کے سبب
جا بجا پیرہن سلگتا ہے

آگ سی لگ رہی ہے پھولوں میں
رنگ و بو سے چمن سلگتا ہے

ہے شرر خیز اک ستیز سرد
جس میں سارا زمن سلگتا ہے

سانچ کو بھی اب آگئی ہے آنچ
پیار کا بانکپن سلگتا ہے

شعلہ آگیں ہے شرم کی شبنم
خنکیِ شب میں تن سلگتا ہے

کرشن موہن سکوں کی حسرت میں
آج اپنا وطن سلگتا ہے

○

میری خرد جنوں میں تبدیل ہو گئی ہے
چاہت سے زندگی کی تکمیل ہو گئی ہے
احساسِ یاس و غم کی تمثیل ہو گئی ہے
یوں میری زندگی کی تشکیل ہو گئی ہے
ہے رہنمائے عالم، میری حکایتِ غم
جو مذہبِ وفا کی انجیل ہو گئی ہے
دل نذرِ غم ہوا ہے، عشرت کا رنگ کھو کر
ارشادِ عاشقی کی تعمیل ہو گئی ہے
دل جگمگا اُٹھا ہے، مجلی ہے وصل کی شب
ظلمت ہی جیسے دل کی قندیل ہو گئی ہے

محسوس ہو رہا ہے دھرتی کی سب اُداسی
جیسے مرے ہی دل میں تحلیل ہو گئی ہے
ہر آرزوئے پنہاں اب شدّتِ نمو سے
ابلاغ بن گئی ہے، ترسیل ہو گئی ہے
جاری رہے گا کب تک یہ کشت خونِ انساں
آدم کی نسل، نسلِ قابیل ہو گئی ہے
ہر ایک مُبتدی کو الہام کا ہے دعویٰ
اب ہر صدا صدائے جبریل ہو گئی ہے
یہ سچ ہے کرشن موہن، تیرے سخن میں ڈھل کر
ہر ایک بات حُسنِ تخئیل ہو گئی ہے

○

گھر بھر میں گونجتی ہیں تری شوخ گالیاں
مچلی ہوئی جوانی بجاتی ہے تالیاں

ہے ایسے میرے دل پہ تمنّاؤں کا ہجوم
نوشہ کو جیسے گھیر لیں البیلی سالیاں

دن رات ماں کی مہر و محبّت ہے میرے ساتھ
ہیں جس کی گالیاں مرے کانوں کی بالیاں

بچپن کے رات دن بھی تھے کیا رونق آفریں
وہ بامزہ شرارتیں وہ گوشمالیاں

رقصاں ہیں دل کی محفلِ رنگیں میں رات دن
کجرارے کارے کارے حسین نینوں والیاں

جیون کا رس بھی اِن میں ہے، جوبن کا جَس بھی ہے
یہ ہونٹ انگبیں کی دل آویزہ پیالیاں

یوں تیری نرم پلکیں ہیں آنکھوں پہ سایہ ریز
جیسے جھکی ہوں جھرنوں پہ سر سبز ڈالیاں

میری نگاہیں، تیرے حجاب و حیا کے طور
کرنوں کی تاک جھانک ہے، پتّوں کی جالیاں

اپنی حیاتِ شوق میں، گھر کے سکُون میں
ہنگامہ زا رہی ہیں تری بے خیالیاں

ہو گا طلوع کب مرا سورج مرا سجن
بَیری برہ کی بدلیاں چھائی ہیں کالیاں

○

شوخ ادا، پُر فتن، مست نشیلے نین
مچلا ہوا بانکپن، چھیل چھبیلے نین

یہ بھی عجب بات ہے، دیتے ہیں دل کو سکوں
چشمۂ افسون و فن، تیرے کٹیلے نین

شوخی و مستی تمام، رام ہے بستی تمام
مد کے پیالے ہیں یہ، تیرے رسیلے نین

نیل گگن ایک جھیل اور ستارے کنول
پشپ بھرے دیپ ہیں تیرے سجیلے نین

یاس ہے کیوں طعنہ زن، آس کے ہیں رہنما
دل کے وکیلے نین، وصل کے حیلے نین

من میں ابھی کامنا، میرا کرے سامنا
رُوپ سے کیسے ہٹیں میرے ہٹیلے نیَن

زرد سی ہے چاندنی، سرد سی ہے زندگی
جب سے ہیں رُوٹھے ہوئے، نیلے انیلے نیَن

دُھوپ ترے رُوپ کی آ کے سُکھا دے انھیں
اوس تری یاد کی، اور ہیں گیلے نیَن

ہے یہ عجب کیفیت، جیسے ترے رقص میں
گھولتے ہیں روح میں بول سریلے نیَن

لاگ ترے تیاگ میں، بھوگ ہے براگ میں
موہ کی بستی ہے من، جوگ کے ٹیلے نیَن

o

عشق جب جاں نثار کرتا ہے — حُسن کچھ اور بھی نکھرتا ہے

چند روزہ حیات کی خاطر — آدمی بار بار مرتا ہے

سوچتی ہی رہے خرد جس کو — عشق وہ کام کر گذرتا ہے

اتنی وحشت بسی ہے دُنیا میں — آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

دل ہے دریائے فکر کا غوّاص — یہ تو پاتال تک اُترتا ہے

ڈھونڈ لاتا ہے گوہرِ معنی — سوچ میں ڈوب کر اُبھرتا ہے

شکوۂ روزگار کرنے سے — کیا مقدر کبھی سنورتا ہے

فطرتِ سادہ کار میں انساں ق — فطنت وفن سے رنگ بھرتا ہے

حُسنِ ظاہر اُسے نہیں بھاتا — حُسنِ باطن پہ دل سے مرتا ہے

کرشن موہن ہے ایک مردِ غنی
بے نیازانہ زیست کرتا ہے

○

تیرگی چھٹ گئی، ہر طرف روشنی بٹ گئی
رات اُس نے جو کپڑے اُتارے تو پو پھٹ گئی
'کام' سورج بنا اور تپنے، چمکنے لگا
گرم رانوں میں دن ڈھل گیا، سرِ شب کٹ گئی
شیشۂ تر بنا چوبِ خشک و جمود آشنا
طبعِ رنگیں مِری، گردِ ایّام سے اٹ گئی
اب وجود اک جمودِ مسلسل کا مسکن بنا
موت چھانے لگی، زیست جیسے پرے ہٹ گئی
میں نے وہ دن گذارے جو اُس بن تو ایسے لگا
کرشن موہن بدن ڈھل گیا، زندگی گھٹ گئی

○

اُف تیری یادداشت کی سنگیں خرابیاں
سو بار دن میں ہوتی ہیں گُم گھر کی چابیاں

آئینۂ طہارتِ دل ہے برہنہ تن
ہیں باعثِ سُرور تری بے حجابیاں

بزمِ شبابِ رفتہ میں صد آب و تاب سے
چھلکائیں طرح طرح کی ہم نے گلابیاں

ہوش و خرد سے جان چُھٹے، لوٹ آئیں کاش
وہ مستیاں شباب کی، وہ نیم خوابیاں

جشنِ نشاط میں بھی مرا دل اُداس ہے
جھُوٹی ہیں، جانتا ہوں، مری کامیابیاں

سوچیں میں شہر شہر لیے پھرتی ہیں مجھے
یہ میرے اضطرابِ دروں کی شتابیاں

ہر شاعر اپنے زعم میں بہکا ہوا سا ہے
یہ بزمِ شعر ہے کہ ہجومِ شرابیاں

○

سر سے پا تک ہے چمک اور لے بدن
شوخ و رنگیں، ایک جامِ مے بدن
اس کی گرمی میں بھی سردی کا سُرور
کامناؤں کا مدھوبن ہے بدن
نوجوانی کا چھبیلا پن ہے یاد
جب تھا دل کے کھیلنے کی شے بدن
رنگ اور رس آج جی بھر کر برس
بہار کے لہراتے بادل! اے بدن

لُطف جب ہے دونوں ہم آہنگ ہوں
روح اک آواز ہے اور نَے بدن

شدّتِ احساس میں شامِ وصال
کر گیا تھا کتنی صدیاں طے بدن

انتقاماً شدّ و مد سے ہے عیاں
رہتا آنکھوں سے نہاں تا کے بدن

اِن کے دم سے زندگی ہے پُرنشاط
جے محبّت، جے جوانی، جے بدن

ہے اندھیرا اِس کے بُجھ جانے کے بعد
کرشن موہن جیو جیوتی ہے بدن

○

تمنّا دل میں قربت کی نہیں ہے — مگر دُوری بھی راس آتی نہیں ہے

محبّت بن چلی ہے مہربانی — کبھی جھگڑا نہیں گالی نہیں ہے

کبھی ہوتا ہوں راز آگاہِ عالم — کبھی اپنی خبر رہتی نہیں ہے

رسجل ہے دھوپ اُتار اپنا سویٹر — کہ اب تو اس قدر سردی نہیں ہے

ملن سا جن سے ہو سپنوں میں کیسے — کہ اب تو نیند بھی آتی نہیں ہے

جنم لیتا ہے وہ جا کر کہیں اور — جو مرتا ہے وہ مرتا ہی نہیں ہے

نہ چمکے اس پہ جب تک میرا سورج — تری دھرتی مری دھرتی نہیں ہے

تصنّع اب ہے شیوہ ہر کسی کا — خلوصِ دل کسی میں بھی نہیں ہے

بھری دُنیا میں تنہا پھر رہا ہوں
مرا کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے

کلب میں لب بہ لب ہر اجنبی سے
ہنسی میں گفتگو اچھی نہیں ہے

گھُٹا جاتا ہے دم بزمِ ریا میں
یہاں تو بات بھی ننگی نہیں ہے

ملن کی رات بے معنی سی ہر بات
جو سچ پوچھو تو بے معنی نہیں ہے

کہاں تک تیرتے جاؤ گے اس میں
یہ میرا جسم ہے ندی نہیں ہے

ترے ہر شعر کی تعریف ہم سے
تکلّف برطرف، ہوتی نہیں ہے

اُٹھائے ہیں کئی صدمات میں نے
مگر میری انا پگھلی نہیں ہے

عجب ہے کرشن موہن کا چلن بھی
کسی میں ایسی خودمستی نہیں ہے

○

یہ کلجگ ہے، اِس دَور میں، یہ تو سوچ
محبّت کی اپروچ ہے کاک روچ

تری یاد تھامے، درخشندہ ہے
مِرا دل تری ساڑھی کا ہے بروچ

نچوڑے گی یہ پتّھروں سے بھی رس
طبیعت میں جب تک ہے موجود لوچ

ہے دُبدھا کا یہ میگھدوت ایک بُھوت
کہ جس نے مِرا دل لیا ہے دبوچ

ٹھہر سی گئی دفعتاً رہگذر
یہ کس شوخ کے پاؤں میں آئی موچ

بہت ہو چکا، چھوڑ دامن مرا
نہ اب اور اے حرصِ زر چہرہ نوچ

جو سمجھے کوئی، بزمِ احباب میں
محبّت کی مظہر ہے گالی گلوچ

بقا کے سرہانے ہے تن کر کھڑا
لیے ہاتھ میں تیغ اجل کا بلوچ

انا کے سہارے پنپتے رہے
زمانے کے اطوار و افکارِ پوچ

○

اونچ اَور نیچ اَور نیچ کا میل ہوں
شوق کی تیز چلتی ہوئی ریل ہوں

پیار کا رہ نگر، تو ہے میرا شجر
میں ترے گرد لپٹی ہوئی بیل ہوں

ناچتا ہوں ترے ہی اشاروں پہ مَیں
تو کھلاڑی مرا، میں ترا کھیل ہوں

امتحانِ جنوں میں تو ہوں پاس میں
امتحانِ خرد میں مگر فیل ہوں

روپ کی دھوپ اور چھاؤں ہے زندگی
ہوں وِپسنجر، کبھی اور کبھی میل ہوں

اہلِ دل کے لیے ایک دُنیا ہوں میں
بے دلوں کے لیے تنگ سی جیل ہوں

کرشن موہن مرا نام ایثار ہے
میں چراغوں میں جلتا ہوا تیل ہوں

○

آکاش میں بھی، دھرتی پر بھی
ہلچل ہے من کے اندر بھی
نُورِ احساس کا طالب ہے
یہ عقل کا تیرہ منظر بھی
اتنا حسّاس ہے قلبِ حزیں
ہر منظر ہے اک خنجر بھی
ہم ہیں ایسے تہذیب زدہ
سنبھلے رہتے ہیں مچل کر بھی
دل کا بھی عجب عالم دیکھا
بندر بھی اور قلندر بھی

جاگ اُٹھتی ہے احساس کی لَو
تو رو دیتے ہیں پتھر بھی
دل یاس اور آس کا سنگم ہے
صحرا بھی اور سمندر بھی
جو ہیروں سے بھی مہنگے ہیں
ہوتے ہیں ایسے کنکر بھی
اہلِ بینش نے تو اکثر
کنکر میں دیکھے شنکر بھی
روشن کر دیتی ہے دل کو
گاہے مجذوب کی ٹھوکر بھی

چھوڑیں گے نہ کیا یہ نفرت و کیں
ہم چندر نگر میں بس کر بھی

○

کامنا کی پیٹھ پہ باندھے ہیں پتھر
اور اس کے پاؤں میں ہے ایک چکّر

دل ہیں تیرہ اور چہرے ہیں منوّر
نیچے جنگل اور اُوپر ہیں سمندر

داشتہ کا، پیار سے بستر لبا کر
فرض بن کر اپنے گھر لیٹا ہے شوہر

کیوں ملن کے بعد تیرے تن کی خوشبو
بھاگتی ہے بند کمرے سے نکل کر

کاش یہ سنسار ہوتا کوہِ افیوں
جس پہ بیٹھے اونگھتے ہم لوگ دن بھر

چاند بھی نکلا ہے آخر اک خرابہ
مختلف باہر سے ہے اندر کا منظر
سونپ دو زہر اپنا انسانو، اسے بھی
اس کے دل میں گھونپ دو وحشت کا خنجر
اس نے بھی آخر ہمیں دھوکا دیا ہے
سُکھ کا تیور بن کے اور چاہت کا زیور
دفتروں کے کام کی بنجر زمیں ہے
بانجھ بھاوج کو نہ اب چھیڑیں گے دیور
چاہ میں تو چندرماں کی چاشنی تھی
واسنا میں آ گئے سورج کے تیور
کلپنا اُپجی نہ آشا، آہ بھرتی
دل کی دھرتی ایک مدّت سے ہے بنجر

○

کاش بن سکتی یہ دھرتی اس کی جھانجھر
چاند ہے آکاش کے ماتھے کا جھومر
بیٹھ جائے جیسے اک طوفان مچ کر
بن گئی ہے راگ تیری آگ بچکر
جا چھپا ہے تو کہاں نظروں سے بچ کر
آس اور وشواس کی یہ راس رچ کر

من پہ ہیں چھائے ہوئے ہٹ دھرم ارماں
جس طرح مچلیں کسی مندر پہ بندر
کوزہ گر تُو نے یہ کیا کوزہ بنایا
بھر دیے ہیں کتنے ہی روگ اس کے اندر
کام پُورا ہو کسی کا یا ادھورا
ٹوٹ جاتا ہے یہ کھا کر غم کی ٹھوکر
ہر قدم پر پیار جھلکے، عجز چھلکے
میری موٹر بھی نہیں نخوت کی ووٹر
آج کل پہچان سکتے ہی نہیں ہیں
ایک سے ہیں کار مالک اور شوفر
رہزنی دونوں کا شیوہ، دیش سیوا
پیل ہے میوہ، کوئی لیڈر ہو کہ لوفر
سوچ کا یہ تیج ہے کیوں سیج پر بھی
جس طرح دستِ نگاریں میں ہو نشتر
کیسے لوٹ آئیں مرے دستِ ہوس میں
اُڑ چکے ہیں تیرے سینے کے کبوتر
کرشن موہن تا بکے یہ کھُردراپن
اب تو کر لے رنگ روغن اس کے اوپر

کیسے پڑھ جاؤں غزل تیری، سراسر
سوچنا پڑتا ہے ہر شعرِ عجب پر
کرشن موہن کچھ سمجھ ہی میں نہ آئے
سر کو کھجلاتا ہوں میں اکثر ٹھہر کر

○

بیٹھی ہے دھوپ میں وہ سوئٹر اتار کر
بانہوں کا بولتا ہوا جادو ہے جلوہ گر

گنجینۂ طلسم ہیں، شہ بیتِ جسم ہیں
باندھے ہوئے کبوترِ سینہ کے بال و پر

اُس کی اداس، سوچتی آنکھوں کا بانکپن
کیف و سرورِ قلب و جگر، عشرتِ نظر

موسم ستم ظریف، زمانہ حریف ہے
رُسوا ہوئی ہے میری تمنا نگر نگر

اب عشق سے گریز، معیشت سے ہے ستیز
اے اہلِ ذوق! یہ ہے غزل کی نئی ڈگر

○

شدّت و حدت و کیفیّت و سوز
زندگی ایک نگاہِ دلدوز

پشتِ عُریاں جو ہے دیدہ افروز
دل و جاں اس سے ہیں لذّت اندوز

پیرہن مُظہرِ آہنگِ بدن
ساز سے چھلکے ہے آواز کا سوز

حُسنِ دل جُو کو ستم خُو مت کہہ
ہر حسینہ تو نہیں کینہ توز

اہلِ دل جان گئے آخرِ کار
کہ تغافل بھی ہے اک پیار کا پوز

دلِ عشّاق پہ تہمت نہ تراش
تیری آنکھیں ہیں محبّت آموز

صرف دنیا ہی نہیں ہے خونیں
دین بھی تفرقہ آگیں، کیں توز

سوچ کے شہر میں پھرتے رہنا
گردشِ ہمہمیں کا چلن ہے شب و روز

○

ہمارا ذکر تک کرتا نہیں کوئی مقالوں میں
اگرچہ ہم بسے رہتے ہیں لوگوں کے خیالوں میں

اندھیرے ہی مجھے ہنستے نظر آئے اُجالوں میں
کہ پردہ پوش تھا جھوٹا سلیقہ با کمالوں میں

دروغِ تفرقہ انگیز کو دیکھا ہے جلوہ گر
کتابوں میں، نصابوں میں، صحیفوں میں رسالوں میں

تری فرسودگی اے قصرِ تہذیبِ کہن پیہم
جھلکتی ہے تری افسردہ دیواروں کے جالوں میں

مری ترسی اُداسی کتنے ہی جنموں کی پیاسی ہے
ابھرتی ہے جو میرے ذہن کے ضدی سوالوں میں

دنوں کے چمپئی چہرے اکھرے اور بے حس ہیں
شمیم دل بسی ہے سوچتی راتوں کے بالوں میں

خرد کی جانچ کیا پہچانتی جوہر محبت کا
جنوں کی آنچ بھی اے کاش ہوتی حُسن والوں میں

وہی لوگ اپنی مستی اور مے نوشی پہ نازاں ہیں
جو پانی پی رہے ہیں میرے ہی جھوٹے پیالوں میں

خیالاتِ عنادو کیں ڈستے جاتے ہیں ہستی کو
جو تیرہ باطنوں میں ہے کہاں وہ زہر کالوں میں

ادب کی انجمن میں، محوِ فکر و فن میں بیٹھا ہے
ہمارا اکھڑ درا پن بھوت بن کر مہ جمالوں میں

مٹے اسبابِ مستی کرشن موہن ہم جو عُمرائے
نہ وہ خوشبو ہے بالوں میں نہ وہ رنگت ہے گالوں میں

کہاں ہے وہ پھبن اب کرشن موہن تیرے جوبن کی
بالآخر آگیا تو بھی سمے چکر کی چالوں میں

○

بدن کی دیوار پہ رواں ہیں
اُداس لمحے کہ چیونٹیاں ہیں
کہیں نہ ہلچل کو نوچ ڈالیں
سکوت کے بھوت بدگماں ہیں
اتھاہ ساگر ہوئے اجاگر
کہاں کہاں من کی بستیاں ہیں
قمر کہے مَیں ہوں سرد پتھر
اُڑانیں انساں کی رائیگاں ہیں
مجھے نہ چھیڑو میں سو رہا ہوں
اُداسیاں میری داسیاں ہیں
سکوں سمندر ہیں اِن کے اندر
یہ آسماں آسماں کہاں ہیں
ہے کرشن موہن کا مضمحل تن
مگر خیالات ابھی جواں ہیں

○

تسخیرِ فکر و عزم کیا آسمان کو
انساں نے کیفِ تازہ دیا ہے جہان کو

ہر آن دیکھتا ہوں تری آن بان کو
تو بھی تو دیکھ میرے جنوں کی اُڑان کو

ایسا فقیر، ایسا قلندر ہے میرا دل
سمجھا ہے اک حباب تموّل کی شان کو

صد حیف دل کی بات کوئی مانتا نہیں
کیوں ڈھا رہے ہیں لوگ وفا کے مکان کو

جوگی کے انگ انگ میں کیا رنگ رچ گیا
بھولا ہے میل جول میں وہ گیان دھیان کو

پربت کی لہر چھوڑ کے پھرتا ہے شہر شہر
بیراگ میں بھی روگ لگائے ہے جان کو

آتے ہیں مسکراتے ہوئے اہلِ مدّعا
مخزن سمجھ کے ایک چمکتی چٹان کو

یہ تیرے کڑوے بول، یہ طعنہ طرازیاں
پہنچا رہے ہیں ٹھیس محبت کے مان کو

غارت کا ترجمان سمجھتے رہے ہیں لوگ
شاخوں پہ انگلیوں کے درخشاں نشان کو

اِس رنگِ اجتہاد کے ہیں مدّعی کئی
توڑا ہے گرچہ میں نے غزل کی زبان کو

○

یہ تصنّع کا پیرہن کھولو
بند ہے من کا اپناپن، کھولو
چاہ کی راہ کا چلن کھولو
رازِ سرمستیِ چمن کھولو
توڑ بھی دو یہ لاج کا بندھن
وصل کی شب ہے، تن بدن کھولو
اجنبیت کی یہ گھٹن کب تک
پاس آؤ، ملن سے من کھولو
شامِ جلوت مہک مہک اٹھے
مصحفِ رنگ و بوئے تن کھولو
گرمیِ خوں سے آپ کا سینہ
تنگ ہے، کوٹ کے بٹن کھولو

اپنی آسودگی نہیں کافی
راہِ آسائشِ وطن کھولو
یہ خموشی ہے حبس کا باعث
انجمن میں درِ سخن کھولو
کام چاہے نہ ہو کوئی اُس میں
اور اک شاخِ انجمن کھولو
راہبر جستجوئے لامحدود
بندِ پیراہنِ زمن کھولو
دھرتی والو کچھ اور بھی ہمّت
بند ابھی ہے مگن گگن کھولو
کرشن موہن رہو گے چپ کب تک
بات دل کی کہو، دہن کھولو

○

مرے شریر کی سرتاج و اسنا میری
کیے ہے لاج کو تاراج و اسنا میری

کھلا ہے غنچۂ احساس پورے جوبن پر
بسنت رُت ہے رتوراج و اسنا میری

ہو تیاگ کیا مرے انوراگ، میری مستی میں
ہے میری زیست کی معراج و اسنا میری

عجیب بات ہے میرے دلِ پریشاں کے
سنوار دیتی ہے سب کاج و اسنا میری

اُداس پیڑ کو ابرِ کرم کی چھیڑ، حیات
ہے تیرے پیار کی محتاج و اسنا میری

بہت دنوں سے ترا انتظار ہے آجا
مچل رہی ہے بہت آج و اسنا میری

اِسی کی جوت سے تیرے بدن کی جوت جلے
شبِ وصال، مری لاج و اسنا میری

تری ہی پیاس، اُداسی ہے کرشن موہن کی
کہ اس پہ بھی ہے ترا راج، واسنا میری

O

اُداس دونوں کے من میں تو آ کے سو جائیں
ملن میں ہو کے مگن لذّتوں میں کھو جائیں
جو گفتگو میں رہیں محو تو رہیں دل شاد
جو اپنے حال پہ سوچیں، اداس ہو جائیں
کسی کو میری تمنّا کا سوز کیا معلوم
یہاں تو اپنا ہی رونا سب آ کے رو جائیں
انھیں کو حاصلِ عُمرِ رواں سمجھ لیجے
جو چند اشک، ندامت کے داغ دھو جائیں
یہ جلوہ جلوہ حسیں رونقیں زمانے کی
اُداسیاں ہی مرے ذہن میں سمو جائیں

○

میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ہے پاگل
اُس کی نظر میں امریکہ ہے، روس ہے پاگل
کچھ بھی نہ سمجھے، قابلِ صد افسوس ہے پاگل
دُنیا محبوسِ نام و ناموس ہے پاگل
یہ تو اک دریوزہ گر دیوانہ نکلا
ہم تو یہ سمجھے تھے اک جاسوس ہے پاگل
روگ ہے یہ مایا جس کا پریوگ نہیں ہے
اتنی پونجی رکھتے بھی، کنجوس ہے پاگل
مُسرِف بیٹوں کے کام آئے گی یہ دولت
سیٹھ بہت کنجوس ہے، مکّھی چوس ہے پاگل
راہگذر میں جب بھی وہ مجھ سے ملتا ہے
ہنس دیتا ہے، مجھ سے بہت مانوس ہے پاگل

سچ پوچھو تو اُس کی ہنسی رونے کی حد ہے
کرتا ہر تکلیف بہت محسوس ہے پاگل

اپنے انت سے غافل ہے، دھندے کا بندہ
عقل و ہوش کے پھندے میں محبوس ہے پاگل

عالمِ کُل تو جانتا ہے واعظ کی حقیقت
پہنے ہوئے کیوں پیرہن سالوس ہے پاگل

جانتا ہے یہ، وہ تو ایک تماشا گر ہے
رحمتِ حق سے جو اتنا مایوس ہے پاگل

خود کو نوچ بھی لیتا ہے، رو بھی دیتا ہے
اپنے آپ کا بھُوت ہے، اک کابوس ہے پاگل

کایا کی یہ جوت ہی مانو کی مایا ہے
سمجھے، یہ مٹی کا دیا، فانوس ہے پاگل

کرشنا موہن ہے یہ دکھاوا من کا چھلاوا
رنگوں میں ملبوس ہے یہ طاؤس، ہے پاگل

○

ستیزہ کار سہی، چاہ تو جتا مجھ کو
میں تیرا میت وفا ریت ہوں، نبھا مجھ کو
گھنیرے سائے تلے تیرے من کے آنگن میں
میں ایک سویا ہوا گیت ہوں، جگا مجھ کو
جنونِ عشق تجھے بے پناہ کردوں گا
ہجومِ شہر میں ننگا کبھی نچا مجھ کو
سماج اب نہیں اپنائے گا، کہاں جاؤں
کہ تو نے لوٹ لیا، پار دلیا، مجھ کو
میں آسکا نہ کبھی کھل کے سامنے تیرے
ہے اپنے آپ سے بس ایک ہی گلا مجھ کو
ہوں مصلحت سے پرے کوستے ہیں لوگ مجھے
ہے سچ کا روگ مجھے، دار پر چڑھا مجھ کو

جتن کے بعد ملی ہے یہ نغمگیٔ مستی
بھٹک کے شاد ہوں میں راہ پر نہ لا مجھ کو

فقط بدن کا ملن دیرپا نہیں ہوتا
میں ایک رات کا رسیا تھا، بھول جا مجھ کو

مچل کے سیج پہ آئے مری رفیقِ حیات
ہوس کا تیج دکھا مثلِ داشتہ مجھ کو

یہ بزمِ ناز میں کھبی، میرے سوچ کے انداز
چلا گیا ہوں بہت دُور میں، بُلا مجھ کو

گناہ کرنے کی توفیق ہی نہیں حاصل
نہیں پسند، کہے کوئی پارسا مجھ کو

رسیلی رُت ہے نشیلی، یہ روٹھنا کب تک
شبِ وصال سپر ڈال دے، رجھا مجھ کو

شدید ذہن کو لپکا ہے سیرِ یورپ کا
نہ ایشیا میں ملی دل کی وشیا مجھ کو

کمل ہے تال میں، ساجن مگر خیال میں ہے
امنگ رنگ سُنا کوئی ماہیا مجھ کو

جو کامنی سے ہوا سامنا تو ہوش اُڑے
ہے کامنا کا بڑا زور، تھامنا مجھ کو

مرے رسیلے بدن پر وہ تیرتا جائے
سلونا سانورا جانے ہے ندیا مجھ کو
جمود موت ہے اور زندگی نمود و شہود
خموش ساز کی آواز ہے "بجا مجھ کو"
کلی کا حسن سراپا ہے بے کلی دل کی
زبانِ حال سے کہتی ہے جو "کھلا مجھ کو"
ہمیشہ کرتے رہے سطح و رنگ کی توصیف
فریب دیتے رہے یار آشنا مجھ کو
رسیلا راجا تو رجنی کا رنگ رسیا ہے
کہ دن ڈھلے تو کہے سنگ ہی سلا مجھ کو
تمام شہر کو ہے بیر کرشن موہن سے
کیا ہے اُس نے بھلا کیا ذرا بتا مجھ کو

O

عُمر بڑھتی جا رہی ہے، زیست گھٹتی جائے ہے
جسم کی خوشبو کی خواہش دُور ہٹتی جائے ہے

سوچ میں بھی اب نہیں پہلا سا تیور اور لوچ
شوق کی دیوار گردِ غم سے اٹتی جائے ہے

بے مزہ ہونے لگی ہے زندگی بعدِ شباب
رات ابھی باقی ہے لیکن نیند اُچٹتی جائے ہے

آ رہی ہے سُکھ مِلن کی چمپئی اُجلی سحر
دُکھ کی یہ بے چین اندھیری رین کٹتی جائے ہے

یاس کے حسّاس لمحوں میں بھی ہے کتنا سرور
شاہدہ اُمّید کی مجھ سے لپٹتی جائے ہے

کام کی افراط ہیں، دفتر کے ہنگاموں میں بھی
تیری یاد آئے، تو توجّہ میری بٹتی جائے ہے

ہے بدن چور اور کومل کس قدر چت چور شام
جیسے شرمیلی دُلہن خود میں سمٹتی جائے ہے

ہے وہ چنچل کامنی محبوب سارے شہر کو
دیکھ کر جس کو نظر میری پلٹتی جائے ہے

بابِ حسرت، داستانِ شوق، تصویرِ امید
لمحہ لمحہ زندگی اوراق اُلٹتی جائے ہے

○

دل میں نئی ترنگ جگاتا ہے سیج پر
کیوں تیرا حُسن مجھ کو ستاتا ہے سیج پر

جب کامنائیں کامنی بنتی ہے دامنی
چاہت کے تیج کا مزہ آتا ہے سیج پر

رہ رہ کے تنگ کرتا ہے میری امنگ کو
غم مجھ کو اپنے سنگ سُلاتا ہے سیج پر

دھارے ہے کام روپ تمھارا تمام جسم
انوراگ راگ من کو سُناتا ہے سیج پہ

رخسار، ہونٹ، سینہ و بازو، سرین وساق
ہر انگ اپنا رنگ دکھاتا ہے سیج پر

○

طعنے سُن سُن کر میرا من اور سلگتا جائے
باہر کی مُسکان مرے اندر کا درد چھپائے
راکھ ہوئے رفعت کے ارماں، راکھ کی ساکھ ہی کیا
نسدن، رہ رہ کر مجھ کو سوزِ حرماں تڑپائے
چھپا وا ہے من کا موتی اور جیون کی جیوتی
جیسے اک البیلا پتّھر ایشور روپ دکھائے
گاہے اُمّید و سرمستی، گاہے کرب و کاہش
ضدّی خواہش تو جیون کو ہر دم ناچ نچائے

مایا موہت، چنچل، بیکل، گیان دھیان کا بیری
کایا پر بھر مایا ہے من، کایا کے گُن گائے

○

ایسی ہو کوئی بات کہ جس میں مزا بھی ہو
مطلع کہیں تو کیا، کوئی مطلع ہُوا بھی ہو

خاموش تھا میں، پھر بھی ہوئے ہیں وہ سرگراں
میرا قصور، میں نے کچھ آخر کہا بھی ہو

آئی ہے اب وہ فکر کی منزل کہ دل کہے
دونوں کی کشمکش میں کوئی تیسرا بھی ہو

ہم اپنے دل ہی دل میں سُلگتے ہیں رات دن
کس کو سُنائیں حال، کوئی آشنا بھی ہو

ہر شخص دورِ نو میں ہے خود سے کٹا ہوا
ہم کس سے منسلک ہوں کوئی سلسلہ بھی ہو

بیوی کی سخت و سرد طبیعت کو جان کر
جی چاہتا ہے اپنی کوئی داشتہ بھی ہو

مشکل سفر ہے، کیسے ملے منزلِ مُراد
رہزن بہت ملے ہیں کوئی رہنما بھی ہو

دل کے معاملات میں کچھ بانکپن تو آئے
رنجش بھی ہو کبھی، کبھی شکوہ گِلا بھی ہو

○

تھے پینترے وہ پیار کے، میں دیکھتا رہا
اک واقعہ کہ اصل میں ناواقعہ رہا

وہ شخص کون تھا جسے آتی تھی خوب نیند
وہ شخص کون ہے کہ جو شب جاگتا رہا

پہنچے اگرچہ عمر کے اونچے پہاڑ پر
آوارگی کا ذہن کو چسکا لگا رہا

اُس کے لیے تو اپنا بدن چوبِ خشک ہے
میرا بدن ترنگ میں شعلہ نوا رہا

احساس کی اساس تھی، وہ سرد پڑ گئی
کس بل مری اُمنگ کا گرمِ وفا رہا

کتنی ہی سوجھ بوجھ ہو تنہائیوں کا بوجھ
اٹھتا نہیں، یہ سوچ سے دل کو گلہ رہا

کیسی ہی بادِ سخت ہو، پہنچی نہ یہ درخت
رخشندہ بخت ہے کہ ہمیشہ ہرا رہا

○

رات سوتے میں دھڑک جا کے مرا من ڈولے
ایک بے تھاہ اُداسی مرے اندر بولے

میرے رس کو کبھی امرت نہیں بننے دیتا
تیرا یہ طعنۂ نایافت سدا بِس گھولے

شدّتِ یاس میں بھی راس رچاتی ہے آس
ہو چلا پچھلا پہر رات کا، اب تو سو لے

کس طرح پائیں سکوں سوزِ دروں سے، ہر دم
منتظر رہتا ہے عفریتِ فنا منہ کھولے

بعد میں اپنی حماقت پہ بھی پچھتا لینا
پہلے ہر شخص سے تقدیر کا رونا رو لے

ہم تو ہیں دھیان میں کھوئے ہوئے جوگی ہم کو
کنکروں میں بھی نظر آتے ہیں شنکر بھولے

کرشن موہن نہ مچل، کچھ تو بدل اپنا چلن
کیسی دُنیا ہے کہ چاہت کو خرد سے تولے

○

لاحاصل ہو چاہت، اتنی بد تو نہیں ہے
اِس کا مسلک استمنا بالید تو نہیں ہے

خویش پرستی کا زیور ہے عیش و مستی
عیش و مستی، ہستی کا مقصد تو نہیں ہے

ظرف اگر عالی ہو، ملتی ہے یہ نعمت
ہر کوئی شایانِ غمِ بے حد تو نہیں ہے

ذہنی بیماری میں بھی عرفاں کے تیور؟
ہر اِمردِ رسیا حضرت سرمد تو نہیں ہے

ہم کو آگے چلنا ہے قدرے دم لے کر
راہِ ہستی کی منزل مرقد تو نہیں ہے

گر شنا آموہن میں اور اُن کی بات نہ مانوں
مجھ کو اہلِ فکر سے کوئی کد تو نہیں ہے

○

تیری راہوں میں سنجوئے میں نے اشکوں کے دیے
میری تنہائی کے گہرے گھاؤ یادوں نے سیے

بعد مدت کہہ رہا ہوں طرزِ کہنہ میں غزل
لاؤں گا لیکن کہاں سے آخر اتنے قافیے

منتظر رہتے تھے روز و شب ملن کی شام کے
کیا بتائیں دُور رہ کر تم سے ہم کیونکر جیے

تھی وہ جنسی بھوک، بھڑکا یوگ دھارے چند لوگ
اپنے ہاتھوں، لوہے کے گولے لیے گھوما کیے

صاحبِ دولت کے گھر تھی منعقد بزمِ سخن
دیر تک بیٹھے رہے ہم بے مزہ غزلیں پیے

دیکھ اے نقادِ فن مقطعے میں بھی مطلعے کی شان
جو کششِ جدت کہ پیدا کی ہے بے کوشش کیے

سر میں جو کیڑا ہے اُس کی پرورش بھی چاہیے
کرشن موہن شاعروں میں گھومتے ہیں اس لیے

○

لہکتے مہکتے چمن جگمگائیں
ہوس میں سلگتے بدن جگمگائیں

جھلکتی ہے تعمیر تخریب میں بھی
کہ زہریلے سانپوں کے من جگمگائیں

اگر چہرے چمکیں تو کیا، لطف جب ہے
کہ اعمال دمکیں، چلن جگمگائیں

سمایا ہے آنکھوں میں سنسار لیکن
مرے من میں ہر دم سجن جگمگائیں

یہ تہذیب تخریب کا آئنہ ہے
کہ من تیرہ ہیں اور تن جگمگائیں

اُداسی میں لہرا س کی جلیسے بن میں
سیہ ہرنیوں کے نین جگمگائیں

جو دل شاد ماں ہوں تو ویرانے میں بھی
گُل و لالہ و یاسمن جگمگائیں

تمدن کے درپن ہیں یہ کرشن موہن
بدن جھلکیں اور پیرہن جگمگائیں

○

کایا نے شوخی سے کھیلا ہے مایا کا کھیل
چنچل من پر چھائی ہے اک سندر نار البیل
شاہِ ایراں کے حق میں ہے اس کا اُلٹا ارتھ
فارسی پڑھ کر بیچ رہا ہے دُنیا بھر میں تیل
مرکز سے ہٹ کر اُکھڑا اُکھڑا گھوموں دن رات
جیسے مُرجھا کر رہ جائے کوئی پیاسی بیل
یہ میلہ تو ختم ہوا اب آئندہ کی بات
کس میلے میں ہوگا جانے، تیرا میرا میل
پیڑوں پر پنچھی بیٹھے ہیں بھولے ہیں یہ بھید
گھوم رہا ہے مست شکاری لے کر شوخ غلیل

دُنیا ہے دراصل اپنے ہی کرموں کی تصویر
چاہے اس کو دیوی سمجھو چاہے ایک چڑیل
باہر کی رسموں سے بالا ہے اندر کا پیار
شرطِ اوّل اخلاصِ دل، بیوی ہو کہ رکھیل
اتنا دھن ہی کافی ہے جس سے جیون سُکھ پائے
وافر دولت کا انجام ہے جُرمانہ یا جیل
جوبن اپنی راس رچائے، وقت گذرتا جائے
کایا بہلے اور من مچلے، چلتی جائے ریل
کیسی میرے فن کی پھبن ہے، کیسا یہ اسلُوب
روز و شب کرتا رہتا ہوں لفظوں سے اٹکھیل
کرشنا موہن یہ سنّاٹا زنّاٹے کا روپ
جیون جھیل ہے ارمانوں کی، جھیل کی لہریں جھیل

○

آشاؤں کی پریاں ہاریں، دیو سمے کے جیت گئے
کومل گات کو ہات لگائے کتنے ہی دن بیت گئے
جیون کے سُونے صحرا میں زار و تنہا پھرتا ہوں
جن پر تھا میرا من موہت، وہ البیلے میت گئے
اپنے آپ کو سب سے اونچا ماننے والے کیا جانیں
کتنے لوگ نبھا کر اس دھرتی سے پریت کی ریت گئے
ارمانوں پر سرد بزرگی اور متانت چھائی ہے
دلکش بچپنا، چنچل جوبن کے من موہن گیت گئے
سُونے من کے سناٹے میں اُن کو کیسا چین ملا
رمتے جوگی تج کر اس دنیا کی جھوٹی پریت گئے

○

سکوتِ حسن میں بھی نغمگی سی لگتی تھی
کلی میں بھی مجھے اک بے کلی سی لگتی تھی

تمام لطف و نزاکت، تمام نکہت و رنگ
ملن سمے وہ رسیلی کلی سی لگتی تھی

خبر نہ تھی کہ ہے چاہت قرار کی دشمن
کہ ابتدا میں تو یہ دل لگی سی لگتی تھی

نکھارتی تھی وہ ننگے بدن سے اپناپن
لباس میں تو مجھے اجنبی سی لگتی تھی

ہر اک ملن میں تھی وہ تازگی وہ تیکھاپن
بدن میں نت نئی دوشیزگی سی لگتی تھی

ہمیشہ بھرتے رہے دوست دم محبت کا
مگر دلوں میں وفا کی کمی سی لگتی تھی

شباب آئے نہ کیوں یاد کرشن موہن کو
جب آگہی بھی اُسے بیخودی سی لگتی تھی

○

زندگی کے آخری لمحے خوشی سے بھر گیا
ایک دن اتنا ہنسا وہ ہنستے ہنستے مر گیا

بُجھ گیا احساس، طاری ہے سکوتِ بے حسی
درد کا دفتر گیا، سامانِ شور و شر گیا

شخصِ معمولی مرا جو مالِ وافر چھوڑ کر
مرتے مرتے تہمتیں چند اپنے ذمے دھر گیا

اس قدر سنجیدہ تھا وہ، دفعتاً بوڑھا ہوا
اور پھر اک دوپہر بیوی کو بیوہ کر گیا

دُور درشن پر طرب آگیں تماشا دیکھ کر
خوش ہوا وہ اس قدر، مارے خوشی کے مر گیا

در حقیقت موت کا مطلب تو ہے نقلِ مکاں
جس طرح کمرے کے اندر سے کوئی باہر گیا

کرشن موہن یہ بھی ہے کیسا اکیلا پن کہ لوگ
موت سے ڈرتے ہیں، میں تو زندگی سے ڈر گیا